محبت صحابہ رضی اللہ عنہم

حضرت مولانا عبید اللہ حسنی ندوی

محبت صحابہ رضی اللہ عنہم

حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

مرتب

محمد ارمغان بدایونی ندوی

سید احمد شہید اکیڈمی
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

ذی قعدہ ۱۴۳۶ھ مطابق ستمبر ۲۰۱۵ء

نام کتاب	:	محبت صحابہؓ
مصنف	:	حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ
مرتب	:	محمد ارمغان بدایونی ندوی
تعداد اشاعت	:	۵۰۰
صفحات	:	۱۰۴
قیمت	:	Rs. 40/-

باہتمام : محمد نفیس خاں ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی

☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب، ندوہ روڈ لکھنؤ

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

جنگ بدر میں شریک صحابہ وفرشتوں کا مقام

شرکاء بدر وحدیبیہ کی فضیلت

(۴۵-۴۸)

انصار سے محبت ایمان کی علامت اور بغض نفاق کی علامت

حضرت ابوبکرؓ کا مقام

حضرت عمرؓ کی خصوصیت

حضرت عثمانؓ کی حیاء

حضرت علیؓ کی فضیلت

حضرت عبداللہ بن مسعود کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو زندگی میں ہی جنت کی بشارت

اللہ کے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی

حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی منقبت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

اہل حق کا یہ امتیاز اور شعار رہا ہے کہ وہ ایک طرف عظمت صحابہ سے سرشار اور ان کی محبت میں ڈوبے ہوتے ہیں تو دوسری طرف اہل بیت کی عظمت و محبت بھی ان کے خمیر میں داخل ہوتی ہے، یہی اہل سنت کی علامت ہے، کسی ایک کی عظمت کو کم کرنا یا معاذ اللہ اندر سے ان کے لیے بغض رکھنا بڑے خطرہ کی بات ہے، اس کے بعد ایمان کا باقی رہنا مشکل ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے حق کو بیان فرمایا ہے، ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صحابہ کی محبت ایمان کی علامت ہے، اور ان سے بغض رکھنا نفاق کی علامت ہے، دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اہل بیت کے حق کی طرف بھی متوجہ فرمایا، اور یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے جو ایمان و یقین کے ساتھ جتنا زیادہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوگا اور آپ کی صحبت میں اس نے وقت گذارا ہوگا وہ اتنا زیادہ

اللہ سے قریب ہوگا اور امت پر اس کا حق سب سے بڑھ کر ہوگا، اور یقیناً یہ شرف صحابہ اور اہل بیت کو حاصل ہوا اور ان میں بھی جو حضرات سب سے زیادہ قریب رہے ان کا حق بھی اتنا ہی زیادہ ہے، حضرت صدیق اکبر، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضی، حضرت حسن وحضرت حسین اور دوسرے کبار صحابہ واہل بیت امت کے لیے سر کا تاج ہیں، ان کی عظمت اور محبت ایمان کا حصہ ہے۔

پیش نظر رسالہ کا یہی اصل موضوع ہے، اس رسالہ میں جس توازن واعتدال کے ساتھ، دل کے جذبات واحساسات کو جمع کیا گیا ہے وہ اس رسالہ کی اصل خصوصیت ہے، جس سے ذہن میں پیدا ہونے والے بہت سے اشکالات خود بخود دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

موضوع کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر " **محبت صحابہ رضی اللہ عنہم** " اور " **محبت اہل بیت رضی اللہ عنہم** " کو الگ الگ رسالہ کی شکل میں شائع کیا جارہا ہے تاکہ موضوع کو اچھی طرح سمجھنا اور اس سے استفادہ میں آسانی ہو۔

یہ رسالے حقیقت میں برادر محترم حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ان دروس کا مجموعہ ہیں جو ان موضوعات پر رمضان المبارک میں دائرہ شاہ علم اللہ کی مسجد میں دیئے گئے، عزیز گرامی

مولوی محمد ارمغان ندوی کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انہوں نے ان کو قلمبند کیا، تصحیح کی اور اشاعت کے قابل بنایا، عزیز موصوف نے جو بیڑا اٹھایا ہے اللہ ان کی مدد فرمائے اور کام پورا فرمائے، اور اس کا بہتر سے بہتر صلہ ان کو عطا فرمائے۔

یہ ایک خاصے کی چیز ہے جو اس موضوع پر تیار ہوگئی ہے، امید ہے کہ خاص و عام کو اس سے فائدہ پہنچے گا، اور ذہنوں میں کبھی جو بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے اس کو دور کرنے میں اس سے مدد ملے گی۔

اللہ تعالیٰ اس کو مفید تر بنائے اور اس کی اس اشاعت کے لیے ان تمام عزیزوں کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے کسی بھی حیثیت سے اس میں شرکت کی۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

۲۸ر شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صحابہ کرامؓ کی چند امتیازی خصوصیات اور ہمارا معاشرہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت وہ پاکیزہ مقدس اور معیاری جماعت تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانی کمالات اور معیاری صفات سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا مربی اعظم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تربیت فرمائی، ایمان ویقین سے ان کے دل ودماغ منور ومعمور ہو گئے ،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی صلاحیتوں کو جو آپسی خونریز جنگوں، قبائلی منافرت، شرک وکفر کی آلودگیوں میں ضائع ہو رہی تھیں، ٹھکانے لگایا اور ایسی قوم کو جو دنیا سے کنارہ کش تھی اور دنیا بھی ان کو کسی طرح کی اہمیت دینے کو تیار نہ تھی، قیادت وسیادت، عظمت وسربلندی کے اس مقام پر فائز کر دیا جس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

اس پیکر حسن و جمال، تربیت نبوی سے آراستہ و پیراستہ، اوصاف انسانی اور کمالات بشری سے متصف بلکہ اس کے لئے نمونہ اور معیاری جماعت کی چند نمایاں اور امتیازی خصوصیات درج کی جاتی ہیں، تاکہ ایک طرف ان کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اور ضرورت معلوم ہو اور دوسری طرف معاشرہ کے افراد اپنی کوتاہیوں اور عیوب کا ازالہ کر سکیں اور اس آئینہ شفاف سے اپنی صورت گری کر سکیں۔

ا۔ صحبت بابرکت

پہلی صفت جو صرف اور صرف انہی کا حصہ ہے جس کے ذریعہ وہ ایمان و یقین کی ان بلندیوں اور اوصاف وکمالات کی ان رفعتوں تک پہونچے جس کا مقابلہ پوری انسانیت بھی مل کر نہیں کر سکتی، وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بابرکت اور آپ کی مجلس نشینی کی سعادت اور ایمان کے ساتھ آپ کا دیدار اور زیارت ہے۔ یہاں تک کہ صحابہ کرام پر (متنوع اور مختلف بلکہ متضاد صفات کے حامل ہونے کے باوجود) صحبت کی صفت غالب آئی اور ان کا لقب قرار پا گئی، گویا صحبت نبوی ان کی ایک ایسی انفرادی صفت تھی کہ اس جماعت کا نام ہی صحابہ پڑ گیا رضی اللہ عنھم وأرضاھم

وارزقنا اتباعهم وحبهم، جس سے صحبت کی اہمیت اور اسکی اثر انگیزی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جو جتنا کامل ہوگا اس کی صحبت وہم نشینی اتنی ہی اثر انگیز ،معنی خیز اور انقلاب انگیز ہوگی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون کامل ہوسکتا ہے، آپ کاملوں کے سردار، انبیاء کے امام، اور اہل نبوت و رسالت، اہل ولایت اور معرفت ،اہل صدق وصفا، ارباب جود وعطا ،اور اصحاب تأثیر وانقلاب کے سر گروہ اور سرخیل تھے، اس لئے آپ کی صحبت میں جو بیٹھا، کندن بن کر نکلا اور ایمان کی نظروں سے جس نے زیارت کرلی، وہ ایمان ویقین کی آخری منزلوں تک جا پہونچا اور چشم زدن میں معراج ولایت حاصل ہوگئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ساحران فرعون کے سامنے وعظ کہا اور اللہ کا خوف دلایا اور انہوں نے اپنی جادوگری کا تماشہ دکھا کر حقیقت کا علم حاصل کرلیا اور تھوڑی ہی دیر میں حضرت موسیٰ کے سامنے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا اعلان کردیا، اسکو فرعون نے ان کی ملی بھگت بتا کر سخت ترین سزا کی دھمکی دی جواب میں ان جادوگروں نے جو ایمان والے ہوچکے تھے اس دھمکی آمیز بھپکی کو کچھ اہمیت نہ دی اور کسی طرح ایمان سے دستبردار ہونے سے صاف انکار کردیا بلکہ پوری ایمانی قوت سے اس سے کہہ دیا: ﴿فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ﴾۔

یہ وہ ایمانی قوت ہے جو بڑے بڑے مجاہدوں اور ریاضتوں کے بعد حاصل ہوتی ہے؛ لیکن ایک عالی مرتبت پیغمبر خدا کی تھوڑی دیر کی ایمان کے ساتھ صحبت نے ان کو اس مقام پر پہونچادیا کہ بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کو زیر نہیں کرسکی۔

اس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا اثر صحابہ کرام پر کیا پڑا ہوگا، ان کے ایمان ویقین کی طاقت کن بلندیوں پر پہنچ گئی ہوگی جس کا کچھ اندازہ صحابہ کرام کے واقعات سے ہوسکتا ہے جو بکثرت کتابوں میں موجود ہیں۔

صحبت کی اہمیت وافادیت

اس لیے تمام علمائے اسلام صحبت کی اہمیت اور افادیت کے قائل رہے ہیں، صحابہ کرام کے بعد تابعین کا درجہ ہے اور ان کے بعد تبع تابعین کا، صحابہ کی خدمت میں آنے جانے والے تابعین ہیں اور ان کی صحبت اور علم سے استفادہ کرنے والے تبع تابعین ہیں۔ یہ وہ صدیاں ہیں جن میں خیر کا پہلو غالب تھا، بھلائی کا چرچا تھا اور اچھے لوگوں کی کثرت تھی، اسکے بعد ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جنھوں نے اپنی فہم پر اعتماد، اپنی رائے پر اصرار اور اپنے علم پر ناز وغرور شروع کردیا جنکی عقل ودانش سطحیت کا شکار اور غلط وبیجا استدلال واستنباط ان کا شعار ہونے لگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے جن کی طرف اشارے مختلف مجلسوں میں فرمائے ہیں، ایک موقع سے فرمایا: اخیر زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہونگے جو اعلیٰ ترین اور بہترین قول (قرآن) سے استدلال کریں گے؛ لیکن دین سے ایسا نکل جائیں گے جس طرح تیر ہاتھ سے نکل جاتا ہے، ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ جب دیکھو کہ دنیا ہی سب کچھ ہوگئی ہے، ہوا وہوس کا دور دورا ہے اور ہر رائے والا اپنی رائے کو پسند کرتا ہے اور عجب میں مبتلا ہے تو ایسے حالات میں اپنی فکر کرو۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ کے مشاہدہ اور ایسے لوگوں کی غلط روش کو دیکھ کر یہ بات اصول تفسیر کے مقدمہ میں لکھی ہے کہ جتنے گمراہ وکج راہ فرقے اور جماعتیں وجود میں آئی ہیں، وہ سب کی سب اپنی عقل وعلم پر زیادہ اعتماد اور علماء ومشائخ کی صحبت وہم نشینی سے دوری کا نتیجہ ہیں۔

آج اس دور میں مختلف افراد اور گروہ ایسی ہی غلطیوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ نہ ان کو سلف کے فہم وبصیرت پر اعتماد رہ گیا ہے، نہ علماء کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور نہ راسخین فی العلم اور علماء ربانیین کی خدمت ومجلس میں حاضری کو ضروری اور بصیرت افروز تصور کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں جابجا ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں کی کثرت، فکری انحراف اور شذوذ کی گرم بازاری، اسلاف پر طعن وتشنیع کا فیشن اور دینی نصوص اور مسلم الثبوت عقائد وحقائق کی من مانی تشریحات کی فراوانی اور ارزانی ہے۔

غرض کہ صحبت کا کوئی بدل نہیں جس طرح رمضان کے مہینہ میں عبادت کا ثواب کئی کئی گنا بڑھ جاتا ہے جو غیر رمضان میں حاصل نہیں ہوسکتا اور مسجد حرام، مسجد نبوی اور بیت المقدس میں نماز پڑھنے کا جو مخصوص ثواب ہے وہ کسی اور مسجد میں حاصل نہیں ہوسکتا ہے، اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت، برکت کا جو فیض اور سعادت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہوگئی وہ کسی غیر کو حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔

اس طرح صحبت کی جو برکتیں اور فیوض ہیں وہ کسی اور طریقہ سے حاصل ہو ہی نہیں سکتے، اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی شرط ایمان تھی اور علماء ربانی اور مشائخ حقانی کی صحبت کی شرط اخلاص ہے اس لئے بہت سے وہ لوگ صحبت میں رہ کر بھی اسکی برکات و فیوض سے محروم رہ جاتے ہیں جو اخلاص سے محروم رہ کر صحبت اختیار کرتے ہیں۔

۲۔ایمان وتصدیق

دوسری صفت جو صحابہ کرام کو دوسروں سے ممتاز اور ان کو جداگانہ حیثیت عطا کرتی ہے، وہ ان کی صفت ایمان اور دل کا یقین اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ہے، انھوں نے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور آپ کو مان لیا تو پھر دل و جان سے تصدیق کی۔ ہر طرح کے شکوک وشبہات اور اعتراضات واشکالات سے

ان کے قلب ودماغ محفوظ ہو گئے، قرآن مجید کی آیتیں نازل ہوتی تھیں، ان کے دل کے دروازے اور دماغ کی گرہیں کھل چکی تھیں، شکوک وشبہات کی جگہ ایمان ویقین نے لے لی تھی اوراعتراضات کے بادلوں اورلشکروں کومعرفت وتصدیق نے چھانٹ دیا تھااورزیر کرلیا تھااوران کو آیات قرآنی اورتعلیمات نبوی کے لیے دلائل کی ضرورت نہ رہ گئی تھی اگر کوئی منکر اسلام اورمنافق، اشکال واعتراض نکال کران کوتذبذب اور ارتیاب کا شکار بنانا چاہتا تواس کوچپ اورمطمئن کرنے کے لئے اسطرح دلیل پیش کردیتے کہ کسی قسم کا کوئی اعتراض واشکال باقی نہ رہ جاتا گویا وہ دلائل کے محتاج نہ تھے بلکہ دلائل میں پھنسی اوراُلجھی طبیعتوں کومطمئن کرنے کے لیے دلائل پیش کردیا کرتے تھے، کیونکہ دلائل کی احتیاجی اکثر انہی کوپیش آتی ہے جوپہلے سے تذبذب کا شکاراورشکوک وشبہات سے زارونزار ہوتے ہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج پرتشریف لے گئے، آسمانوں اوروہاں کے مکینوں کے عجیب وغریب مشاہدات سے سرفراز ہوئے اورآپ نے صبح یہ واقعات ومشاہدات اہل مکہ کے سامنے بیان کیے توصحابہ کرام کوکسی قسم کا تذبذب اورشک پیش نہیں آیا؛ لیکن مکہ کے کافروں میں ہلچل مچ گئی؛ کیونکہ ان کی طبیعتوں میں پہلے سے ہی شکوک وشبہات کے کانٹے

چھپے ہوئے تھے تو انھوں نے اس کا خا کہ اڑانا شروع کیا اور بھاگے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ شخص شک میں پڑجائے تو معاملہ آسان ہو جائے گا۔ ان سے کہا: سنا سنا آج رات تمہارے ساتھی آسمانوں کی سیر کر کے آئے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہایت سکون واطمینان سے جواب دیا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو سچ فرمایا۔ وہ حیرت میں پڑگئے اس پر حضرت ابوبکرؓ نے دلیل پیش کی کہ جب ہم یہ مان چکے ہیں کہ حضرت جبرئیلؑ دن میں کئی کئی مرتبہ آتے جاتے ہیں تو اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کا مالک دن ورات کی کسی بھی گھڑی میں سیر کرادے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس واقعہ کی تصدیق کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں پیش آئی کہ حضرت سلیمانؑ کا واقعہ بیان کرتے، چودھویں صدی کے خلائی سفروں کا انتظار کرتے؛ بلکہ ان کی تصدیق نے دلیل فراہم کی۔

آج کل کے ہمارے پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ حضرات نئی نئی ایجادات اور سائنسی دنیا کے انقلابات سے ایسا مرعوب ہو چکے ہیں کہ قرآنی نصوص اور صحیح نبوی تعلیمات کو بھی اس پر رکھ کر پرکھتے ہیں اور ایمان ایسا کمزور ہو گیا ہے کہ ان نصوص میں تبدیلی کے علمبردار بن جاتے ہیں، خود تو بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔

نہایت افسوس کی بات ہے نہ قرآن کا صحیح مطالعہ کیا نہ رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات وارشادات سے اشتغال رکھا نہ ایمان ویقین سے آشنا ہوئے اور نہ تصدیق کی منزلوں سے گذرے؛ لیکن قرآن میں تبدیلی، ارشادات نبوی میں حذف واضافہ؛ بلکہ ان کا سرے سے انکار کرنے لگتے ہیں؛ کیونکہ ان کے زعم میں زمانے کی روشن خیالی، ترقی اور نئی نئی ایجادات کا وہ ساتھ نہیں دے سکتے، وہ کہنے لگتے ہیں ایک زمانہ تھا جب انھوں نے بہت اچھا رول ادا کیا تھا؛ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، حالات بدل گئے ہیں، انسان بدل گیا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب بہانے ہیں نہ انسان بدلا ہے نہ زمانہ بدلا ہے؛ بلکہ اس وقت قرآن وسنت کی جتنی شدید ضرورت ہے اتنی کبھی نہیں تھی، پرانی جاہلیت نئے رنگ وروپ میں پھر پلٹ آئی ہے، شراب پرانی ہے جام نیا ہے، وہی سارے کھیل کھیلے جارہے ہیں جو دور جاہلی میں تھے، نام نئے ہیں، رنگ نئے ہیں، ڈھنگ نئے ہیں۔

مزید افسوس اس پر بھی ہے کہ ہمارے دینی حلقہ کے کچھ افراد جو تعلیم یافتہ حضرات کی ہم نوائی کرنے لگتے ہیں اور دبے پاؤں بعض اسباب کی وجہ سے یہ روگ ان میں بھی سرایت کرجاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

ضرورت اسی ایمان کی ہے جو صحابہ کو حاصل تھا اور جو ان کی صحبت

میں بیٹھ کر ہی مل سکتا ہے، ان کے ایمان افروز واقعات اور تصدیق وایقان کی کیفیات دیکھی جائیں اور ان کے اپنے ایمان کی چنگاری کو فروزاں اور تصدیق کو مہمیز کیا جائے۔

۳۔ اطاعت وفرمانبرداری

تیسری امتیازی صفت صحابہ کرام کا جذبہ اطاعت اور فرمانبرداری ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو آخری حکم، فیصلہ کو آخری فیصلہ سمجھنا اور اس کو دل وجان سے تسلیم کرنا ان کا ایسا شعار بن گیا تھا کہ انھوں نے اپنے جذبات کی لگام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بات نکلی اور ادھر عمل کے لئے قدم اٹھے یہ امتیاز کرنا مشکل ہونے لگا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے لفظ پہلے نکلا ہے یا عمل کے لئے قدم پہلے اُٹھے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مسجد میں داخل ہونے والے ہیں کہ اچانک کان میں یہ آواز آتی ہے کہ بیٹھ جاؤ! وہیں بیٹھ جاتے ہیں یہ گوارہ نہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سن لینے کے بعد آگے بڑھ جاتے جتنے قصے قضیے پیش آتے تھے وہ دربار رسالت مآب میں پہونچ کر فوراً ختم ہو جاتے تھے، اور یہ کیفیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی باقی رہی کہ جب کوئی مسئلہ پیش آیا اور اس میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کا حکم مل گیا فوراً مسئلہ حل ہوگیا، کسی نے اچھی تصویر کشی کی ہے ؎

شریعت کے قبضہ میں تھی باگ ان کی
بھڑکتی نہ تھی خود بہ خود آگ ان کی
جہاں کر دیا نرم نرما گئے وہ
جہاں کردیا گرم گرما گئے وہ

سخت سے سخت محاذ پر، بڑی سے بڑی جنگ میں اور خطرناک سے خطرناک موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جان و مال اور اہل وعیال کی پرواہ کئے بغیر کود پڑنا ان کے لیے بائیں ہاتھ یا بچوں کا کھیل تھا؛ لیکن ان کا امتیاز یہ بھی ہے کہ جنگ آزمودہ ہوتے ہوئے اور جان جوکھم میں ڈال کر بڑے سے بڑا معرکہ سر کر لینے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود جب برداشت کا موقع آیا اور خاموش رہ کر بلکہ ظاہری اعتبار سے دب کر صلح کرنے کا موقع آیا تو اس وقت بھی اطاعت و فرمانبرداری سے دست کش نہیں ہوئے جس کی کھلی مثال صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے اگر اس نظر سے غزوات وسرایا کا مطالعہ کیا جائے اور صحابہ کی اطاعت وفرمانبرداری کو دیکھا جائے تو اس کی نظیر نہیں ملے گی کہ کس طرح صحابہ کرام نے سمع وطاعت کو نباہ کر دکھا دیا۔

لیکن ہمارا معاشرہ اس صفت سے بالکل خالی ہوچکا ہے۔ نہ

اطاعت ہے نہ فرمانبرداری اگر قرآن مجید کی نصوص اور احادیث رسول ﷺ بھی پیش کردی جائیں تو بھی ایک طبقہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اور ظاہری اعتبار سے پیچھے چلنے والوں کی اطاعت کی جانے لگی، ان کے جذبات کا خیال کیا جانے لگا، جو مطاع تھے وہ مطیع ہوگئے، جو مقتدا تھے وہ مقتدی ہوگئے، جن کو حق کہنا چاہئے تھا وہ عوام سے ڈر گئے مصلحتوں کی آڑ لے کر حق کو چھپانے لگے، اسکا نتیجہ جو ہونا چاہئے تھا، وہ ہوکر رہا۔

۴۔ ذہنی پختگی اور عقلی بلوغ

صحابہ کرام کی چوتھی صفت ذہنی پختگی، عقلی بلوغ اور ذہنی و دماغی تربیت کا کمال ہے۔ اگر ایک طرف وہ سرافگندگی، سپردگی، اطاعت وفرمانبرداری اور تسلیم و رضا کے امام تھے تو دوسری طرف ذہنی و عقلی صلاحیتوں سے پورا پورا استفادہ کرتے تھے اور ان کا صحیح استعمال جانتے تھے، کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی غیر معمولی تربیت اور نگرانی میں ان کے ذہن ودماغ کو اسطرح تیار کر دیا تھا کہ اندھے بہروں کی طرح زندگی نہ گزاریں جابیجا، حق ناحق، تقلید و پیروی کی راہ نہ اپنائیں۔ ذہن کو کھلا رکھیں، عقل ودانش کا استعمال کرتے رہیں، شاہراہ شریعت اور جادہ سنت پر بصیرت کے ساتھ گامزن ہوں تا کہ کوئی شیطانی وسوسہ یا غلط سازش ان

کی راہ کھوٹی نہ کرنے پائے جس کا اصول آپ ﷺ نے یہ کہہ کر بیان کردیا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے کسی بھی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں، کوئی انسان اس لائق نہیں کہ اس کے ساتھ خدا کا سا معاملہ کیا جائے اور اسکی بات کو خدائی حکم کا درجہ دیا جائے، بڑوں کی اطاعت چاہے امیر ہو یا شیخ، پیر ہو یا فقیر، حاکم ہو یا عالم اس حد تک کی جائے جسکی اجازت اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ نے دی ہے۔

حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحشؓ کی امارت میں ایک قافلہ 'السریہ' روانہ کیا، تمام قافلہ والوں کو امیر کی اطاعت کا حکم دے دیا، کسی بات پر امیر صاحب کو ناراضگی ہوگئی، انھوں نے تمام ہم رکاب لوگوں کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی بابت حکم یاد دلایا، سب نے اقرار کیا، اس پر لکڑی لانے اور اس میں آگ لگانے کا حکم دیا اور سب نے حکم مانا اور لکڑیوں میں آگ لگادی، اس کے بعد امیر نے حکم دیا کہ آگ میں آپ لوگ کود جائیں سب نے انکار کردیا، واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے معاملہ پیش ہوا، آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر یہ کود جاتے تو ہمیشہ اسی میں رہتے۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ زمانہ جاہلیت سے یہ بات پورے معاشرہ میں تسلیم کی

جارہی تھی کہ ہر حال میں اپنے برادر، اپنی قوم اور اپنے خاندان کا ساتھ دینا ہے، اس میں حق و ناحق کی تمیز نہ تھی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی بالا دستی اور اسکی نصرت کی ترغیب دی، صحابہ کو اس پر تیار کیا، ان کی تربیت کی اس کے بعد ایک موقع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے درمیان یہ بات دہرائی کہ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہ کرام نے اس جملہ کا پرانا مفہوم قبول کر لینے میں تردد محسوس کیا، اسلئے فوراً اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرلیا کہ مظلوم کی مدد تو ہم کر سکتے ہیں؛ لیکن ظالم کی مدد کیسے اور کس بنیاد پر کریں؟ اسکے جواب میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ظالم کی مدد کا مفہوم واضح فرمایا کہ اسکو ظلم سے باز رکھو، ہاتھ پکڑ لو، ظلم نہ کرنے دو۔

ان واقعات سے صحابہ کرام کی ذہنی پختگی، عقلی بلوغ اور بیدار مغزی معلوم ہوتی ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تربیت ہی اس انداز سے فرمائی تھی کہ ایک طرف کامل اطاعت، مکمل انقیاد، بے مثال تابعداری اور فرمانبرداری پائی جاتی تھی تو دوسری طرف بیدار مغزی، عقلمندی دانشمندی اور بالغ نظری اپنی تمام خوبیوں اور کمالات کے ساتھ پائی جاتی تھی۔ ایک واقعہ سے مزید اس کی وضاحت ہو جاتی ہے: دو حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا قضیہ لے کر پہنچے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک

صاحب کے حق میں فیصلہ فرمادیا، جن کے خلاف فیصلہ ہوا تھا جب وہ واپس جانے لگے تو کہنے لگے: ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس بلوا کر فرمایا: ایسی عاجزی قابل ملامت ہے، اللہ اس کو اچھا نہیں سمجھتا پوری طرح ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے اس کے بعد بھی کام نہ بن سکے تو کہنا چاہئے: ﴿حسبنا اللّٰه و نعم الو کیل﴾۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلمانوں کی عام طور سے اور ارباب حل وعقد کی خاص طور سے ایسی ذہنی تربیت ہونی چاہئے کہ عقل و دانائی، فہم وفراست کا استعمال صحیح انداز سے کرسکیں؛ لیکن افسوس ہے کہ ہم مسلمانوں کا حال یہ ہوگیا ہے کہ پڑے سوتے رہتے ہیں، دشمن اپنی چالوں وجالوں سے گھیر لیتا ہے، راستے مسدود کر دیتا ہے، اسباب ووسائل منقطع کر دیتا ہے، ہم اپنے ذاتی اختلافات اور فروعی مسائل میں الجھنے اور تفسیق وتکفیر کا بازار گرم کرنے میں لگے رہتے ہیں، حکومتیں بھی اس کا شکار ہیں، جماعتیں اور افراد بھی اس میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں اور جب کوئی بڑی مصیبت آپڑتی ہے تو صرف زبان سے ﴿حسبنا اللّٰه و نعم الو کیل﴾ کہنے لگتے ہیں۔

نہ ذہنی تربیت، نہ صحیح شعور اور نہ فکر ونظر میں گہرائی ہے۔ کہاں کیا کرنا چاہئے کہاں کیا نہ کرنا چاہئے کس محاذ پر کس چیز کی ضرورت ہے اس

وقت زمانے کا تقاضہ کیا ہے، کس چیز کے مقابلہ میں کون سی چیز اہم ہے، اس کے نتیجہ میں جو خسارہ اور نقصان پوری امت کو پہنچ رہا ہے، وہ غیر معمولی اور صدیوں پیچھے کر دینے والا ہے، اللہ تعالیٰ اس خسارہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۵۔ اخلاص اور خواہشات پر قابو

صحابہ کرام کی پانچویں صفت اخلاص وللّٰہیت، خواہشات نفس پر قابو ہے، اس پاکیزہ وممتاز جماعت کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ کوئی کام بھی ذاتی غرض اور منفعت کے پیش نظر کسی نیت بد کے نتیجہ میں نہیں کرتے تھے، وہ ہر کام اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے کرتے، اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے جو خود مخلصوں کے سردار تھے، ان کے دل و دماغ کو اخلاص کے سانچے میں ڈھال دیا تھا اور وقتاً فوقتاً ان کے سامنے اس کی اہمیت اور عند اللہ مقبولیت واضح فرماتے رہتے تھے، بنیادی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، تنہا ظاہری اعمال چاہے وہ کتنے ہی بھلے اور اچھے معلوم ہوتے ہوں، کیسے ہی خوشنما ہوں اگر وہ روح اخلاص سے خالی، نیت بد سے داغدار کئے جا چکے ہیں تو عند اللہ ذرا بھی قابل قبول نہ ہوں گے، صحابہ کرام کو اس میں خاص امتیاز حاصل تھا جسکو سمجھنے کے لئے ایک واقعہ کافی ہے جو بہت

مشہور اور اپنی اثر انگریزی و دل پذیری میں بے مثال ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقابلہ ایک یہودی سے پڑ گیا، حضرت علیؓ نے اسکو زیر کر کے قتل کا ارادہ کیا، اس نے چہرہ مبارک کو سامنے پا کر اس پر تھوک دیا، حضرت علیؓ فوراً اس کو چھوڑ کر الگ کھڑے ہو گئے، وہ اس عمل کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا، پوچھنے پر حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے قتل کر رہا تھا جب تم نے تھوکا تو نفس اس میں س شامل ہو گیا اور مجھے غصہ آ گیا اس لئے میں نے چھوڑ دیا۔ یہ سن کر یہودی کی دنیا بدل گئی کہ اللہ اکبر نفس پر ایسا قابو، جنگ و جدال میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا ایسا حال، کلمہ شہادت پڑھ کر دین اسلام کی حقانیت کا اعلان کر دیا۔

اسی طرح خواہشات ایجابی ہوں یا سلبی، باہری دنیا دیکھ کر پیدا ہوئی ہوں یا اندرونی جذبات کا عکس ہوں، دونوں ہی میں صحابہ کرام کی بے مثال ثابت قدمی اور استقامت اور راہ سنت و شریعت پر استواری ان کا شعار رہا ہے۔ حضرت علیؓ کا واقعہ گزر چکا ہے کہ یہودی کے تھوک دینے سے اندرونی انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا اور نفس کا شدید تقاضہ ہوا کہ اسکو فوراً تہ تیغ کر دیا جائے، حضرت علیؓ نے اس پر قابو پا کر ایک جان کو جہنم سے بچا لیا اور خود کو انتقامی جذبہ اور نفس کے تقاضہ پر عمل سے بچا لیا جو اکثر و بیشتر شیطانی وسوسہ اندازی اور نفس امارہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ اندرونی تقاضے سے جذبات اور خواہشات پیدا ہوئی ہوں یا بیرونی دنیا کی کارفرمائی ہو جس کی مثال یہ ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت یمن پہونچی، وہاں انھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا جو اس سے قبل نہ دیکھا تھا اس لئے دل میں کبھی اس کا خیال بھی نہ آیا، دیکھا کہ وہاں کے لوگ اپنے سردار و آقا کو سجدہ کرتے ہیں، ان کو خیال آیا کہ اس سردار کی کیا حقیقت اور کیا حیثیت؟! ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو سرداروں کے سردار ہیں اور سرور عالم ہیں، وہ اس مقام پر ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ایسی تربیت فرمادی تھی کہ مکہ اور مدینہ میں ان کو خیال بھی نہ آیا کہ وہ سجدہ کو سوچیں اور اس کا خیال بھی لائیں؛ لیکن جب ان کی نظر پڑی کہ سجدہ روا رکھا جا رہا ہے اور لوگ اپنے سرداروں کو سجدہ کرتے ہیں تو ان کو بھی اس کی خواہش ہوئی، انھوں نے یہ نہیں کیا کہ آتے ہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سجدہ میں گر جاتے اور آپ ﷺ کے منع کرنے پر رکتے؛ بلکہ دربار رسالت میں پہونچے اور پورا واقعہ بیان کیا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ ہم بھی آپ کو سجدہ کرنا چاہتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے روک دیا اور آئندہ بھی قبر پر سجدہ کرنے سے صاف منع کردیا۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام کی ایک جماعت حاضر خدمت تھی کہ ایک اونٹ آیا اور اس نے اللہ کے رسول ﷺ کے

سامنے سجدہ کیا، یوں صحابہ کرام کو خیال نہیں ہوا تھا، اونٹ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے عرض کیا کہ اللہ کے رسولؐ! جانور بھی آپ کو سجدہ کرتے ہیں ،ہم زیادہ مستحق ہیں کہ آپ کو سجدہ کریں۔ آپ ﷺ نے منع فرمادیا اور کہہ دیا کہ کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ کسی دوسرے کو سجدہ کرے، اگر دنیا میں کسی کو اجازت ہوتی تو عورت کو حکم ہوتا کہ شوہر کو سجدہ کرے۔

صحابہ کرام کا امتیاز یہی ہے کہ دل پر شدید داعیہ سجدہ کا بیدار ہوا، لیکن انھوں نے عمل کرنے سے پہلے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ ﷺ کیا فرماتے ہیں، دوسرے یہ کے ازخود یہ خواہش اور داعیہ نہیں پیدا، بلکہ غیروں کو دیکھ کر دوسرے علاقوں کا دورہ کرکے پیدا ہوا۔

آج ہمارا حال یہ ہے کہ خواہشات پر ہی عمل کرنا ہمارا شیوہ ہے، جذبات کی پیروی ہمارا شعار ہو گیا ہے، جی چاہی زندگی ہم گزارنے میں لگے ہوئے ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کی فکر نہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی سنت کا خیال اور نہ شریعت کا پاس ولحاظ، نہ جانے کیسی کیسی نیتیں ہمارے نہاں خانہ دل میں چھپی رہتی ہیں؛ بلکہ اب تو معاملہ یہاں تک پہونچ گیا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ کام جو ظاہر میں بہت اچھے ہیں بری نیت سے کرتے ہیں، ورنہ یہ تو عام مرض ہے کہ استحضار نیت کا ہوتا ہی نہیں، بڑے سے بڑا دینی کام، دعوتی کام اور تدریسی کام کریں گے لیکن نیت ندارد۔

دوسری بات یہ ہے کے جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں، کسی نے کچھ بتادیا ، کسی نے کچھ پڑھا دیا کرنے لگے کہیں کچھ نظر آ گیا اور بھا گیا اسکے پیچھے دوڑ پڑے نہ اللہ کی مرضی معلوم کرنا نہ اللہ کے رسول کی تعلیمات سے روشنی حاصل کرنا، صحابہ کرام کے دور میں اس طرح کی غلط چیزیں نہ ہونے کے برابر تھیں ،یمن گئے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تو بھی ان کی احتیاط کا عالم یہ تھا کہ اسکو بھی پوچھ لیا، ہمارے زمانے کا حال یہ ہے کہ ہر طرف غلط چیزوں کا طوفان برپا ہے پھر بھی ہم کو پوچھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی حالانکہ اس وقت زیادہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کی ضرورت ہے، اسکا نتیجہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی قبروں پر عرس اور میلے ٹھیلے کا بازار گرم ہے اور قبروں کے ساتھ وہ کیا جارہا ہے جو کسی صحابی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا؛ بلکہ گھوڑے اور گدھے کی قبروں پر بھی اچھے خاصے میلے اور عرس ہونے لگے ہیں، غرض یہ کہ ملت اسلامیہ کے فرزندوں میں ایسے مشرکانہ اور کافرانہ اعمال گھر کر گئے ہیں کہ ان میں سے ایک بھی ملت سے خارج کرنے کے لئے کافی ہے۔

دوسری طرف ہماری مغربی تہذیب میں ڈوبا ہوا طبقہ ہے، اس نے مغرب کی ہر ہر ادا کو سند کا درجہ دے رکھا ہے، اسکے سامنے نہ قرآن وحدیث کی کوئی قیمت ہے اور نہ صحابہ کرام اور سلف صالحین کی کوئی حیثیت، حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ دونوں طبقے ہر ہر بات جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ

وسلم سے دریافت کرتے، قرآن وحدیث سے پرکھتے اور علماء حق سے معلوم کرتے اور پھر عمل کرتے، اللہ تعالیٰ سب کو اسکی توفیق عطا فرمائے۔

۶۔ توبہ وانابت

صحابہ کرام کی چھٹی صفت توبہ اور انابت الی اللہ ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ کرام بھی انسان تھے اور گناہوں کا صدور ان سے بھی ممکن تھا؛ بلکہ اسوہ کی تکمیل کے لئے ضروری اور معیاری توبہ رجوع وانابت الی اللہ کے لئے لازمی تھا۔

جن صحابہ سے گناہوں کا صدور ہوا پھر اس پر جو ان کو خلش اور اپنے کیے ہوئے پر جو ندامت ہوئی، وہ صرف انہی کا حصہ ہے۔ ماعز اور غامدیہ کے واقعات شاہد عدل ہیں کہ ان کو اپنے گناہ پر ایسی ندامت ہوئی اور اسکے لئے انھوں نے ایسی قربانی دی کہ رحمت الٰہی کو جوش آیا اور ان پر ایسی رحمت کی بارش ہوئی کہ اگر پورا شہر مدینہ اسکے ذریعہ اپنی بخشش کروانا چاہتا تو ہو جاتی۔ ع

یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حد جاری کرتے وقت ایک صاحب کے نازیبا کلمات سن کر منع فرمایا اور ان کی توبہ کی قبولیت اور اس پر اللہ تعالیٰ کی مغفرت ورحمت کو اسطرح بیان فرمایا کہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توبہ کو

معیار قرار دیا کہ انھوں نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اہل مدینہ پر تقسیم کر دی جائے تو ان سب کو اپنے سایہ میں لے لے۔ حضرت ابولبابہ سے لغزش ہوئی، مسجد کے کھمبے سے اپنے کو باندھ دیا اور ایک ہفتہ اسی طرح رہے یہاں تک کہ قبول توبہ کا مژدہ سنا اور پروانہ رحمت پالیا، ایسا گنہگار بندہ جو اس انداز کی توبہ کرنے والا ہو وہ تو محبوب خدا بن جاتا ہے۔

وحشی جن کے سر پر حضرت حمزہؓ کے قتل کا بوجھ تھا، اگرچہ انہوں نے کفر کی حالت میں ایسا کیا تھا پھر بھی مارے شرمندگی وندامت کے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہ آتے تھے، وہ بوجھ اس وقت اترا جب انھوں نے مسیلمہ کذاب کو جو دشمن خدا و رسول تھا قتل کیا اور مسلمانوں کو بڑے امتحان سے بچالیا رضی اللہ عنہ وأرضاہ، نہ جانے کتنے واقعات ہیں؛ ہمارے صحابہ کرام سے لغزشیں ہوئیں؛ لیکن ان پر ندامت کے ایسے آنسو بہائے اور اس کے کفارے کے لیے ایسے مجاہدات کیے کہ امت کے لئے قیامت تک کے لیے نمونہ چھوڑ گئے۔

ہمارا حال یہ ہے کہ گناہوں سے آلودہ ہیں، دن رات گناہوں میں پڑے رہتے ہیں توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوتی اگر ہوئی بھی تو صرف زبانی۔

توبہ برلب سبحہ در کف دل پر از ذوق گناہ

زبان پر توبہ، ہاتھ میں سبحہ اور دل میں گناہوں کی خواہش اور شوق۔

یہ ہے ہماری کیفیت، اس پر طرہ یہ کہ اپنے گناہوں کا جواز پیدا کرنے کی تلاش میں رہتے ہیں بعض تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ صحابہ بھی تو گناہ کرتے تھے ہم کرتے ہیں تو کیا؟ وہ تو خیر کا زمانہ تھا جب بھی گناہ ہوتے تھے یہ تو شر کا ،فتنہ کا زمانہ ہے۔ گویا صحابہ کو اپنے گناہ کے لئے سند اور معیار قرار دیا ہے حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے گناہ پر ندامت و شرمساری اور اسکے کفارہ کے لیے جو مجاہدات اور مشقتیں اٹھائی ہیں، وہ اس میں نمونہ اور معیار ہیں نہ کہ گناہ میں۔ وہ انابت الی اللہ اور رجوع الی الحق میں اسوہ ہیں نہ کہ اپنے گناہوں پر اصرار کرنے اور اسکا جواز ڈھونڈنے میں، اس تبدیلی کو صحابہ کرام نے محسوس کرتے ہوئے اپنے شاگردوں کے سامنے یہ بات کہی کہ تمہارا حال یہ ہے کہ بڑے بڑے گناہوں کو بس اتنا سمجھتے ہو کہ ناک پر مکھی بیٹھی اور اُڑ گئی، ہم معمولی گناہوں کو بھی ہلاک اور برباد کردینے والا سمجھتے تھے جب تک توبہ نہ کرلیتے چین نہ آتا تھا اور اس طرح گھبرائے رہتے تھے کہ پہاڑ ہمارے سروں پر ٹپکتا ہے جو گرا ہی چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس اللہ والی، نبی کی چاہنے والی، پیغام خدا اور رسول کو بے کم و کاست پہنچانے والی جماعت پر اپنی بے حساب رحمتیں نازل فرمائے اور پوری امت کی طرف سے ان کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔

یہ ان کی چند خصوصیات کی طرف اشارے ہیں جو ایک خاکپائے

صحابہ رسول رضی اللہ عنہم اجمعین بطور نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے۔ان کی تمام خوبیوں، خصوصیات اور امتیازات کو پیش کرنا ناممکن ہے، یہ چند امتیازی اوصاف اس لئے بیان کیے گئے ہیں کہ فی زمانہ ان اوصاف میں کھلی ہوئی کوتاہی محسوس کی جارہی ہے اور ان پر ایسے دبیز پردے پڑتے جارہے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ یہ اوصاف ڈھونڈنے سے نہ ملیں گے۔دوسرے یہ بھی کہ ان چیزوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے ذہن بھی صاف نہیں ہیں اگر کسی اللہ کے بندے کا اس مبارک ومقدس جماعت کی طرف سے ذہن صاف ہوجائے اور ان کی محبت پیدا ہوجائے تو میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب اور کامیاب سمجھوں گا۔صحابہ کرام کی امتیازی خصوصیات کی فہرست بہت طویل ہے، ان کی جانثاری وفداکاری، محبت وشوق، علم وآگہی، اخلاق کریمانہ، تعلیم وتربیت، دعوت وارشاد، انسانی ہمدردی اور شفقت ومحبت غرضیکہ ان کے کمالات اور ممتاز اوصاف کی فہرست بہت طویل ہے، اگر توفیق ملی تو ان پر بھی آئندہ کچھ رقم کرکے سعادت میں اضافہ کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ توفیق عطا کرے اور آسان بنا کر قبول فرمائے، آمین۔

صحابہ کرام کا معمولی صدقہ ہمارے بڑے صدقات پر بھاری ہے

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَسُبُّوْا أَصْحَابِيْ، فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَباً مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيْفَهُ. (۱)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے صحابہ کو برا نہ کہو، اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے (اس خرچ کرنے والے) کا ثواب ان کے ایک مُد (سیر بھر) یا آدھ مد کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔

---

(۱)صحیح البخاری، کتاب فضائل الصحابة: ۳٦٧٣

فائدہ:- مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کا مقام اس قدر بلند ہے کہ ان کا مٹھی بھر خرچ کیا ہوا بھی ہمارے پہاڑ کے برابر خرچ کرنے سے بہتر ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ ان کے مقابلہ میں آنا ہی نہیں چاہیے یعنی اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ ہم نے زیادہ کام کیا ہے تو ثواب بھی ہم ہی کو زیادہ حاصل ہونا چاہیے، تو ایسا نہیں ہے، کیونکہ ہر کام کی کچھ نوعیت ہوتی ہے، اور وقت کا مسئلہ ہوتا ہے، نیز حالات کا تقاضہ ہوتا ہے، غرض کہ تمام باتوں کو دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کس کو کیا مقام حاصل ہونا چاہیے؟ جیسا کہ ایک وہ شخص ہے جو جاں بلب ہو، پیاس کی وجہ سے تڑپ رہا ہو، اور اچانک اس کو کوئی دو گھونٹ پانی میسر کر دے، تو ایسے مشکل وقت میں اس شخص کو جو پانی کا لطف اور پانی پلانے والے کا جو احسان یاد رہے گا، وہ زندگی بھر اس کو کبھی نہیں بھول سکتا ہے، لیکن ایک وہ شخص ہے جس کو خاص پانی کا کوئی تقاضہ نہ ہو لیکن کوئی اس کو پلا دے تو طبیعت خوش ہو جائے، بالکل یہی معاملہ ہماری اور صحابہ کی زندگی کا ہے کیونکہ اس وقت بالکل انسانیت جاں بلب تھی، اور اس کو ایک نور کی ضرورت تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے وقت کے لیے تیار کیا تھا کہ انہوں نے اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر رہتی دنیا کے لیے بہترین نمونہ پیش کیا، اسی لیے اگر کوئی شخص ان کی جانفشانی کے حالات کا مطالعہ کرے تو دنگ رہ جائے گا، لیکن افسوس کہ آج کل صحابہ کے حالات کے

مطالعہ کا ذوق ہی ختم ہو جاتا ہے، حالانکہ بزرگوں کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ پابندی کے ساتھ حالات صحابہ کا مطالعہ فرماتے تھے، اسی لیے حضرت مولاناؒ نے ایک موقع سے فرمایا کہ حضرت رائے پوریؒ دس دس صحابہ کے حالات پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس میں بہت مزا آتا ہے۔

کیونکہ صحابہ کرام کے نزدیک اصل قرآن وسنت پر عمل کرنا تھا اور اپنی زندگی کو صحیح رخ پر گزارنا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں زیادہ کرامات وغیرہ کا سلسلہ بھی معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ان کے نزدیک اصل مقصدِ حیات دعوت دین کا کام تھا، نہ کہ کرامات کے اندر الجھنا، لیکن آج کے دور میں اگر دیکھا جائے تو زیادہ تر لوگ صرف کرامات ہی کے چکر میں الجھے رہتے ہیں اور اپنے اصل مقصد سے غافل رہتے ہیں، حالانکہ اسلامی نقطہ نظر تو یہ ہے کہ انسان اپنے کام میں لگا رہے اگر چہ شروع میں دل نہیں لگے گا لیکن جب اپنے آپ کو اسی کام میں لگا دے گا تو ایک دن خود بخود اللہ تعالیٰ اس کو اس کام میں استقلال عطا فرمائیں گے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان جب بھی کوئی دین کا کام شروع کرنے جاتا ہے تو جہاں اس کو کوئی چمتکار نظر آ جاتا ہے بس وہیں سے وہ عقیدہ کو خراب کر کے اور اپنے اصل مقصد زندگی سے غافل ہو کر دنیا کی بے جا فضول باتوں میں مگن ہو جاتا ہے، چہ جائیکہ وہ قرآن وسنت پر عمل کرتے ہوئے

(۱) كتاب البر والصلة في باب المرء مع من أحب، رقم: ٢٦٤٠

اپنے فرض منصبی کو سمجھ کر دعوت دین کے کام کو آگے بڑھانے میں صحابہ کی طرح سے پیش پیش رہتا۔

مقصد اصل ہے

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت سعدؓ اور حضرت سلمانؓ کو اپنے قافلہ کے ساتھ دریائے دجلہ پار کرنا تھا، لیکن اس کے لیے کوئی کشتی وغیرہ کا انتظام نہ تھا، چنانچہ دونوں نے غور کیا کہ قافلہ میں جب کوئی گناہ گار نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ ہماری ضرور مدد فرمائے گا، لہٰذا ہم کو اسی حالت میں اپنے گھوڑوں کو دریا کے اندر ڈال دینا چاہیے، روایت میں آتا ہے کہ تمام کے تمام حضرات نے دریا میں گھوڑوں کو ڈال دیا اور سب لوگ سکون وعافیت کے ساتھ دریا کو پار کر گئے اور کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوا، یہاں تک کہ جب پار ہو گئے تو حضرت سعدؓ نے اعلان کیا کہ اگر کسی کا کچھ سامان دریا میں ڈوب گیا ہو تو وہ بتائے، چنانچہ ایک صحابی نے اپنے کسی برتن کے کھو جانے کی شکایت فرمائی، لہٰذا حضرت سعدؓ نے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اے دریا! اگر تیرے اندر ان صحابی رسول کا کوئی برتن رہ گیا ہو تو اس کو باہر نکال، چنانچہ فوراً ہی وہ برتن بھی سامنے نکل کر آ گیا اور سارے لوگ نجات پا گئے، لیکن اس واقعہ کو صحابہ کرام نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی، کیونکہ ان کا مقصد دریا سے آسانی کے ساتھ

پار ہو جانا نہیں تھا، بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ اس دریا سے پار ہو کر اگلے پار کے لوگوں کو راہ ہدایت پر لانا ہے، معلوم ہوا کہ انسان کو ہمیشہ اپنے سامنے اصل مقصد کو مدنظر رکھنا چاہیے نہ کہ کرامات میں الجھنا چاہیے۔

اسی طرح حضرت عتبہ بن نافع رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ جب جنگل سے گزر رہے تھے تو انہوں نے کہا: اے جنگلی جانوروں! ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے والے (ان کے صحابہ) آرہے ہیں، ہم کو یہاں سے گزرنا ہے، ابھی تم یہاں سے نکل جاؤ، دیکھنے میں یہ بات بظاہر معمولی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ شیر، بھیڑیا، سانپ غرض کہ تمام ہی جانور اپنے بچوں کے ساتھ بھاگ رہے ہیں اور جنگل صاف ہو رہا ہے، اس لیے کہ انہوں نے یہ کہا تھا "ہم صحابہ ہیں"، لہٰذا ہم کو بھی یہ چاہیے کہ جب ان کا نام آجائے تو ہم بھی ہوشیار ہو جائیں، کہ جب صحابہ کے آنے سے جنگل، سمندر غرض کہ بڑے بڑے مخالفین بھی زیر ہو جاتے تھے تو ہم بدرجہ اولیٰ ان کے ماننے والے ہیں، خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی طرف سے ہمارے ذہن میں کوئی برائی پیدا ہو جائے اور ہمارا ایمان ہی خطرہ میں پڑ جائے۔

آج کا حال

لیکن افسوس کہ آج ہم صرف انہی کرامات کے اندر الجھ کر حقیقی

مقصد سے غافل ہو چکے ہیں اسی لیے آج اگر کہیں کسی درخت کے نیچے کوئی قبر نکل آئے تو سارے لوگ وہیں سجدہ کرنے میں مست ہو جاتے ہیں، حالانکہ صحابہ کا حال تو یہ تھا کہ جب حضرت عمرؓ نے یہ دیکھا کہ لوگوں کے دلوں میں اس درخت کی تعظیم کچھ زیادہ بڑھ رہی ہے جس کے نیچے بیٹھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ سے بیعت لی تھی تو قبل اس کے کہ کوئی شرک کی بات پیدا ہوتی حضرت عمرؓ نے اس درخت ہی کو کٹوا دیا، کیونکہ ان کے نزدیک اصل چیز ایمان کی حفاظت تھی، اسی لیے ان کا ایمان بھی ہمہ وقت تازہ رہتا ہے۔

اسی لیے اگر آج ہم میں سے کوئی یہ چاہے کہ ہمارا ایمان بھی ویسا ہی ہو جائے تو اس مقام تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلے ایمان کی تازگی کا ہونا شرط ہے، جو کہ آج کے دور میں بالکل مفقود ہے، اور صحابہ کے دور میں یہ چیز بہت عام تھی، کیونکہ اولاً تو ان حضرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل تھی، اور ان کا کنکشن ڈائریکٹ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا، لیکن ہم لوگ زمانہ کے اعتبار سے چونکہ بہت دور ہو گئے اس لیے اگرچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسر نہیں ہو سکتی، لیکن ان لوگوں کی صحبت آج بھی اختیار کی جا سکتی ہے جو ان صحابہ کی زندگیوں کو اپنا نقش قدم بنائے ہوئے ہیں، لیکن آج اس چیز کا بھی رجحان کم ہوتا جا رہا ہے۔

تازہ ایمان کی ضرورت

اسی طرح سے ایمان کی تازگی کا دوسرا ذریعہ یہ بھی ہے کہ آپس میں بیٹھ کر کچھ دین وایمان کی باتیں کی جائیں، جیسا کہ صحابہ کرام کا معمول تھا وہ فرماتے تھے کہ "اجلس بنا نومن ساعة" یعنی آؤ کچھ گھڑی بیٹھ کر ایمان کی باتیں کرلی جائیں، لیکن آج کل اس کام کو کرنے کی بھی کسی کے پاس فرصت نہیں ہے، گویا کہ ہم اپنے ایمان کو اس قدر اعلیٰ سمجھتے ہیں کہ ہم چاہے جس جگہ بیٹھیں، اور جہاں بھی جانا چاہیں چلے جائیں لیکن ہمارا ایمان سلامت رہے گا، اس کو تازہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اسی لیے آج کالج کے پڑھے لکھے لوگوں کا ایمان اتنا کمزور ہوتا ہے کہ ان کو بالخصوص اسلام کے دشمن اپنا ہدف بآسانی بنالیتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایمان بہت غیرت والی چیز ہے، جنت تک پہنچانے والی چیز ہے اور دل ودماغ کو روشن کرنے والی چیز ہے اور دلوں کو تازہ اور ان کے اندر جوش بھر دینے والی چیز ہے، غرض کہ ہم جس قدر ایمان کی گہرائی میں داخل ہوں گے وہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا، چونکہ صحابہ کرام اس کے اندر تک داخل ہوتے چلے گئے تھے اس لیے اللہ نے ان کو یہ مقام عطا فرمایا تھا، کہ وہ حضرات اپنے مقصد کی اشاعت میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور اللہ کے علاوہ کسی بھی چیز سے ڈرنے والے نہیں تھے۔

جنگ بدر میں شریک صحابہ وفرشتوں کا مقام

عَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَ جِبْرِيْلُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا تَعُدُّوْنَ أَهْلَ بَدْرٍ فِيْكُمْ؟ قَالَ: "مِنْ أَفْضَلِ الْمُسْلِمِيْنَ" أَوْ كَلِمَةً نَحْوَهَا، قَالَ: وَكَذٰلِكَ مَنْ شَهِدَ بَدْراً مِنَ الْمَلَائِكَةِ. (۱)

ترجمہ:- حضرت رفاعہ بن رافع فرماتے ہیں: حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ اہل بدر کو آپ کس شمار میں سمجھتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا (ہم ان کو) مسلمانوں میں افضل ترین سمجھتے ہیں، یا اسی طرح کی کوئی بات فرمائی، حضرت جبرئیل نے فرمایا: یہی حکم ان فرشتوں کا ہے جو بدر میں شریک تھے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی: ۳۹۹۲

فائدہ:- مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوا کہ جنگ بدر میں جو صحابہ کرام شامل تھے ان کا مقام نہایت بلند ہے، کیونکہ یہ وہ تاریخی معرکہ ہے جس کے اندر حق کو غلبہ حاصل ہوا تھا اور باطل کو شکست فاش دی گئی تھی، چونکہ یہ جنگ ایسے نازک حالات میں واقع ہوئی تھی کہ اگر اس وقت حق کو غلبہ حاصل نہ ہوا ہوتا تو اس کے اثرات ہمیشہ کے لیے روئے زمین پر نمایاں رہتے، اسی لیے روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر اللہ کے رسول ﷺ مستقل یہ دعا فرمارہے تھے "اللھم ان تھلک ھذہ العصابہ فلن تعبد فی الارض" یعنی اے اللہ! اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت تیری راہ میں ہلاک ہوگئی تو روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کون ہوگا؟ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی یہ دعا قبول فرمائی اور حق کو غلبہ نصیب ہوا، چنانچہ اسی کی طرف قرآن میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ﴾ یعنی ہم نے تمہاری مدد کی ہے "بدر" سے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس روز بدر کے مقام پر حق کو غلبہ حاصل نہ ہوا ہوتا تو روئے زمین پر تم اللہ کا نام ہی نہ لے رہے ہوتے، بلکہ وہیں اہل ایمان کا خاتمہ ہوجاتا، اس لیے اللہ کے رسول ﷺ یہی دعا فرمارہے تھے "اللھم ان تھلک ھذہ العصابہ فلن تعبد فی الارض" لیکن جب بدر میں حق کو فتح حاصل ہوئی تو گویا کہ بدر کی فتح سے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی مدد کی ہے جو قیامت تک جاری رہے گی۔

بدری صحابی کا واقعہ

اسی لیے جو صحابہ اس معرکہ میں شریک تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اپنے خاص فضل کا معاملہ فرمایا اور ان کی بخشش کا اعلان بھی کیا ہے، روایت میں آتا ہے کہ جب حضور ﷺ نے فتح مکہ سے پہلے اپنا خفیہ منصوبہ تیار کیا تاکہ آسانی ہو سکے تو اس خفیہ منصوبہ کو حضرت حاتم بن ابی بلتعہؓ نے مکہ والوں کے یہاں ایک خط لکھ کر واضح کر دیا، لیکن اللہ کے رسول ﷺ کو اس کا علم ہو گیا، لہٰذا آپ ﷺ نے ان صحابی کو بلایا اور کہا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ اتفاق سے وہیں پر حضرت عمر بھی موجود تھے انہوں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر آپ کی اجازت ہو تو ان کی گردن جسم سے الگ کر دوں، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، ایسا نہ کرو، کیونکہ یہ بدری ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے تمام بدریوں کو معافی کا پروانہ دے دیا ہے، البتہ آپ ﷺ نے ان صحابی سے اس راز کے عام کرنے کا مقصد جب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ مکہ میں میرے گھر والے موجود ہیں، مجھے طبعی محبت کی بنیاد پر یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو، ادھر سے مکہ پر خفیہ چڑھائی ہو جائے اور میرے گھر والے بھی ہلاک ہو جائیں، اس کے علاوہ میری نعوذ باللہ ایسی کوئی نیت نہیں تھی کہ میں دشمنان اسلام کی مدد کروں۔

شرکاءِ بدر وحدیبیہ کی فضیلت

عَنْ حَفْصَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: انِّى لَأَرْجُوْ أَنْ لَا يَدْخُلَ النَّارَ انْ شَاءَ اللّٰهُ أَحَدٌ شَهِدَ بَدْراً وَالْحُدَيْبِيَّةَ، قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَلَيْسَ قَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ﴿ وَإِنْ مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ﴾ قَالَ: أَلَمْ تَسْمَعِيْهِ يَقُوْلُ: ﴿ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيْنَ اتَّقَوا﴾

وَفِى رِوَايَةِ مُسْلِمٍ عَنْ أُمِّ بِشْرٍ: لَا يَدْخُلُ النَّارَ انْ شَاءَ اللّٰهُ مِنْ أَصْحَابِ الشَّجَرَةِ أَحَدٌ مِنَ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا تَحْتَهَا.(۱)

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: كُنَّا يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ أَلْفاً وَأَرْبَعَمِائَةٍ، قَالَ لَنَا النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم: أَنْتُمُ الْيَوْمَ خَيْرُ أَهْلِ الْأَرْضِ. (۲)

---

(۱)سنن ابن ماجة، كتاب الزهد: ٤٢٨١ (۲)صحيح البخارى: ٤١٥٤

ترجمہ:- حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں پوری امید کرتا ہوں کہ جو بھی بدر وحدیبیہ میں شریک ہوئے ہیں وہ جہنم میں نہیں جائیں گے، انشاء اللہ۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا ہے ﴿وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾ (اور تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کا گزر اس تک نہ ہوا ہو) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے نہیں سنا ہے وہ فرماتا ہے ﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا﴾ (پھر انہیں ہم نجات دے دیں گے جو اللہ سے ڈرتے تھے)۔

مسلم کی ایک روایت حضرت ام بشر سے ہے کہ اصحاب شجر میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا، جس نے اس کے نیچے بیعت کی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ ہم صلح حدیبیہ کے وقت چودہ سو تھے، (تو ہم کو مخاطب کرتے ہوئے) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ آج روئے زمین پر تم (لوگ) سب سے بہتر ہو۔

فائدہ:- مذکورہ بالا روایات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اہل بدر کے ساتھ معافی کا معاملہ فرمایا ہے اسی طرح سے وہ صحابہ کرام جو صلح حدیبیہ کے موقع پر شریک تھے ان کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ نے خاص رحم وکرم کا معاملہ فرمایا ہے، کیونکہ جس طرح جنگ بدر میں دین کے لیے صحابہ کرام کی جانفشانی کا اعلیٰ نمونہ سامنے نکل کر آتا ہے اسی طرح صلح حدیبیہ میں ان کی اطاعت وفرمانبرداری کا بھی مکمل ثبوت ملتا ہے، اس لیے کہ جب صحابہ کرام نے عمرہ کی نیت سے احرام باندھ کر مکہ مکرمہ آنے کا عزم مصمم کرلیا تھا لیکن اس کے بعد جب راستہ میں روک دیئے گئے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کو حالات کا جائزہ لینے اور صلح پر آمادہ کرنے کے لیے بھیجا تھا، لیکن کچھ لوگوں نے یہ افواہ عام کردی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کردیا گیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں پر فوراً ایک درخت کے نیچے تمام صحابہ سے موت اور جہاد کرنے کی بیعت لی کہ اس بدتمیزی کا ان کو ضرور جواب ملنا چاہیے، لیکن کچھ دیر بعد معلوم یہ ہوا کہ حضرت عثمانؓ کے متعلق عام کی ہوئی خبر صرف افواہ تھی، الغرض اس کے بعد ان کی طرف سے کچھ شرائط پیش کیے گئے اور کہا گیا کہ ان کے مطابق تمہارے اور ہمارے درمیان صلح ہونی چاہیے، جو شرائط بظاہر انہی کے حق میں تھے، اسی لیے اس وقت بعض صحابہ کا یہ کہنا تھا کہ ہم

الحمدللہ اس پوزیشن میں ہیں کہ کفار سے مقابلہ کیا جاسکے، لیکن ایسے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ اس سے آگے کی حکمت و مصلحت بھی دیکھ رہے تھے اس لیے آپ ﷺ نے حکم دیا کہ ایسا نہیں ہوگا بلکہ اس مرتبہ ہم سب واپس جائیں گے، اور آئندہ سال انشاء اللہ ضرور آئیں گے، معلوم ہوا کہ دنیا میں اطاعت و فرمانبرداری کی مثال اس سے بڑھ کر ملنا بہت مشکل ہے کہ ایسے وقت میں جب کہ دشمن صحابہ کے جذبات سے کھیل رہے تھے، اور صحابہ کرام بھی تلواروں کو نیام سے باہر نکال کر لڑائی کے منتظر تھے، لیکن چونکہ حضور ﷺ کا حکم یہ تھا کہ جنگ نہیں ہوگی تو صحابہ نے اپنے جذبات کو ترجیح نہ دیتے ہوئے آپ ﷺ کے حکم کو ترجیح دی، اسی لیے آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ میں شرکاء کے تعلق سے فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔

انصار سے محبت ایمان کی علامت اور بغض نفاق کی علامت

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: اَلْاَنْصَارُ لَا یُحِبُّھُمْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا یُبْغِضُھُمْ اِلَّا مُنَافِقٌ، فَمَنْ اَحَبَّھُمْ اَحَبَّہُ اللّٰہُ، وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ اَبْغَضَہُ اللّٰہُ. (۱)

ترجمہ:- حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے بارے میں فرمایا: ان سے محبت کرنے والا مومن ہوگا، اور بغض (نفرت) رکھنے والا منافق، جو ان سے محبت کرے گا اللہ اس سے محبت کرے

(۱)صحیح البخاری، کتاب مناقب الأنصار: ۳۷۸۳

گا، جو ان سے بغض رکھے گا، اللہ اس سے بغض رکھے گا۔

فائدہ:- جو حضرات صحابہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئے تھے ان کی مدد کرنے والے مدینہ کے صحابہ کو انصار کہا جاتا ہے، کیونکہ انصار کے معنیٰ "مدد کرنے والے کے ہیں" دنیا کی تاریخ میں مدد کرنے کی کوئی مثال اس قدر شاندار اور عمدہ نہیں ہوسکتی جو مثال انصار صحابہ نے مہاجرین صحابہ کی مدد کر کے قائم فرمائی ہے، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بدر کے مقام کی طرف نکلنا چاہا تو جب انصار صحابہ کی رائے لی کہ ان کا کیا ارادہ ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہہ دیا تھا کہ تم اور تمہارا رب جا کر لڑیں ہم یہاں اطمینان سے بیٹھے ہیں، بلکہ ہم آپ کے ایک ایک حکم پر مرمٹنے کے لیے تیار ہیں، اسی طرح بعض صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار و مہاجرین کے درمیان مواخات کرادی تو جس کے پاس دو بیویاں تھیں انہوں نے یہ چاہا کہ میں ان میں سے ایک بیوی کو طلاق دے کر مہاجر بھائی کی خدمت میں پیش کردوں، کیونکہ ان حضرات کے یہاں مفاد پرستی اور خود غرضی کا شائبہ ہی نہیں تھا، بلکہ ان کا ہر عمل اللہ کی رضا کے حصول کے لیے ہوتا تھا، اور انصار صحابہ کی یہی وہ

قربانیاں ہیں جن کی وجہ سے رسول ﷺ ان کو سب سے زیادہ چاہتے تھے، جیسا کہ مذکورہ بالا روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے، جس میں فرمایا: جو ان سے محبت کرتا ہے وہ مومن ہے، اور جو نفرت کرتا ہے وہ منافق ہے۔

فرمان نبوی ﷺ

اسی لیے روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے کچھ مال آیا، چنانچہ آپ ﷺ نے وہ مال مہاجرین صحابہ میں تقسیم فرمادیا، لیکن اس میں انصار کا حصہ نہ ہوسکا، چنانچہ لوگوں میں کچھ آپسی چہ مہ گوئیاں شروع ہوگئیں، کہ اللہ کے رسول ﷺ جتنا مہاجر صحابہ کو محبت کرتے ہیں شاید ہم کو نہ کرتے ہوں، لیکن جب یہ خبر اللہ کے رسول ﷺ کو معلوم ہوئی تو آپ نے فوراً سب کو ایک جگہ جمع کیا، اور فرمایا: اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں ہے کہ سب لوگ مال وزر لے کر لوٹیں، لیکن آپ اللہ کے رسول کے ساتھ ہوں، آگے فرمایا: تم خاص ہو، لوگ عام ہیں، میرا مرنا اور جینا تمہارے ساتھ ہے، چنانچہ آپ کی اس تقریر کا صحابہ پر ایسا اثر ہوا کہ سب کی چیخیں نکل گئیں۔

ایمان کی علامت

لہذا جن سے حضور ﷺ کو اس قدر محبت ہو بلاشبہ ایسے حضرات

کے بارے میں ذرہ برابر بھی دل کے اندر میل رکھنے سے ایمان خطرہ میں پڑسکتا ہے، لیکن اگر کوئی ان سے محبت کرتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ بھی پسند فرماتا ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کی نصرت کرنا اور دین کی نصرت کرنے والوں سے محبت کرنا ایمان کی علامت ہے، اور یہی وہ ایمان ہے جو ہم سب سے مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت ابوبکرؓ کا مقام

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذاً خَلِيْلاً لَاتَّخَذْتُ أَبَابَكْرٍ خَلِيْلاً، وَلٰكِنَّهُ أَخِيْ وَصَاحِبِيْ. (۱)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر میں (خدا کے سوا) کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن میرے وہ بھائی اور ساتھی ہیں۔

فائدہ:- تمام اہل سنت والجماعت کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقام انبیائے کرام کے بعد سب سے بلند ہے، اسی لیے آپ کو "أفضل البشر بعد الأنبياء بالتحقيق" بھی کہا جاتا ہے، لیکن اگر یہ غور کیا جائے کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں حضرت

(۱) صحيح البخاري، كتاب فضائل الصحابة: ٣٦٥٧

ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ بلند مقام کس طرح حاصل ہوا تو معلوم ہوگا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کچھ ایسی صفات تھیں جن کی بنیاد پر آپ کو یہ رتبۂ بلند حاصل ہوا۔

آپ کی پہلی صفت ''صدیق'' ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ انبیاء کے بعد صدیقیت کا مقام سب سے اونچا ہے، اس لیے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ (النساء: ٦٩) اسی لیے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے صدیقیت کے مقام پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: جب انبیائے کرام کا دسترخوان لگایا جاتا ہے تو اس پر اذن عام ہوتا ہے، لیکن جب انبیاء فراغت حاصل کر لیتے ہیں تو اس کے بعد صدیقین اس دسترخوان پر بیٹھتے ہیں، اس لیے کہ انبیاء کے بعد سب سے بلند مقام انہیں کا ہے، اور صدیقین کے گروہ میں سب سے بلند و بالا حضرت ابوبکرؓ کا مقام ہے، اس لیے کہ صدیقین کے بھی درجات ہیں۔

اسی لیے مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکرؓ سے خاص تعلق تھا، کیونکہ آپ نے فرمایا اگر میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو خلیل بناتا تو حضرت ابوبکرؓ کو بناتا، لیکن خلیل صرف اللہ تعالیٰ ہی ہوسکتا ہے، اس لیے یہ میرے ساتھی ہیں اور دوست ہیں، اور یہ

حقیقت ہے کہ جس قدر صحبت کا موقع حضرت ابوبکر کو حاصل ہوا وہ شاید ہی کسی اور کو حاصل رہا ہو، اس لیے کہ حضرت ابوبکر نبوت سے پہلے بھی آپ کے دوست رہے اور نبوت کے بعد بھی مستقل آپ کی رفاقت کا حق ادا کرتے رہے، یہاں تک کہ جب آپ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تب بھی آپ نے ان کی رفاقت کا حق ادا کر کے دکھایا، اسی لیے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے تمام محسنین کا احسان چکا دیا ہے، سوائے ابوبکر کے، لہٰذا اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ ہی ان کو عطا فرمائے گا۔

اسی طرح ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن روزہ دار کے لیے فلاں دروازہ کھول دیا جائے گا، فلاں شخص کے لیے فلاں دروازہ کھول دیا جائے گا، تو حضرت ابوبکر نے معلوم کیا، اے اللہ کے رسول! کیا کوئی ایسا بھی ہوگا جس کے لیے جنت کے سارے دروازے کھول دیئے جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص آپ ہی ہیں۔ اللہ اکبر!!

صدیق کا مصداق کون؟

صدیق کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے، اور جس کے اندر یہ تینوں صفات ہوں گی وہی صحیح معنی میں صدیق ہوگا، (۱) زبان کی سچائی (۲) عمل کی سچائی (۳) حال کی سچائی، یعنی کسی انسان کے قول و

فعل اور حال وعمل میں کوئی تضاد نہ پایا جاتا ہو، لیکن ان تینوں سچائیوں کا جمع ہونا آسان نہیں ہوتا، البتہ اگر کسی کی یہ تینوں چیزیں نبی کے ہم آہنگ ہوجائے تو اس کا مقام بہت بلند ہوجائے گا یعنی اول یہ کہ اس کا قول نبی کے قول کے مطابق ہوجائے، اور اس کا عمل نبی کے عمل کے مطابق ہوجائے، اسی طرح اس کا حال بھی نبی کے حال کے مطابق ہوجائے، اور چونکہ یہ تمام صفات حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اندر بخوبی موجود تھیں اس لیے ان کو صدیقیت کا بلند مقام بھی حاصل ہوا، اس لیے کہ ان کو اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی حضور اکرم ﷺ کی بارے میں تردد وتذبذب پیش ہی نہیں آیا، مثلاً: جس وقت اللہ کے رسول ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ایک لمحہ بھی تردد کے بغیر ایمان قبول کیا، البتہ بقیہ سب کو تردد پیش آیا، سوائے ابوبکر وخدیجہ کے، اور اصلاً یہی صدیقیت کا مقام ہے کہ انسان کو کبھی کسی طرح کا تردد پیش ہی نہ آئے۔

عمل کی یکسانیت

البتہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے تو حضرت ابوبکرؓ کبھی بھی نبی کے عمل کی مخالفت نہیں فرماتے تھے، روایت میں آتا ہے کہ جب حضور ﷺ نے اخیر عمر میں حضرت اسامہ کے لشکر کو روانہ کرنے کا حکم دیا تھا، لیکن وہ آپ کی حیات میں نہ ہوسکا، چنانچہ آپ کی وفات کے بعد

حضرت ابوبکرؓ نے تمام صحابہ کے منع کرنے کے باوجود بھی آپ کے اس حکم نافذ کیا، کیونکہ جو حکم نبی ﷺ کا تھا حضرت ابوبکر اس سے (نعوذ باللہ) کس طرح روگردانی کر سکتے تھے، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے بھی اس موقع سے فرمایا: مدینہ کے سیاسی حالات اس قدر ساز گار نہیں ہے کہ ابھی لشکر روانہ کیا جائے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کی بھی ایک نہ سنی، بلکہ حضرت عمر سے فرمایا: آپ تو جاہلیت میں بہت دم دار تھے اور اسلام میں بزدل ہونا چاہتے ہو؟ غرض کہ جو حکم نبی ﷺ نے جاری کیا تھا اس کو حضرت ابوبکرؓ نے تمام صحابہ کی ناپسندیدگی کے باوجود بھی پورا کیا۔

غیرت ایمانی

اسی طرح آپ ﷺ کی وفات کے بعد مانعین زکاۃ کا جو مسئلہ پیش آیا اس میں آپ کی زبان سے نکلا ہوا تاریخی جملہ بھی صدیقیت کے مقام کو واضح کرتا ہے آپ نے فرمایا: "أینقص الدین وأنا حی" یعنی میرے جیتے جی دین میں کوئی کتر بیونت نہیں ہو سکتی، درحقیقت آپ کا یہ ایمانی کیفیت سے لبریز جملہ ایسا ہے جو کہ موجودہ زمانہ میں ہر انسان کے لیے آئیڈیل ہونا ضروری ہے، کہ جہاں بھی وہ ہو اس کے ہوتے ہوئے دین میں کسی طرح کی رخنہ اندازی کی کوئی دشمن ہمت تک نہ کر سکے، کیونکہ اس حمیت کا ہونا بھی صدیقیت کے ایک مقام میں سے ہے۔

اسی طرح جب حضور ﷺ کی وفات کا مسئلہ پیش آیا تو تمام صحابہ ایسے حادثہ پر اپنا ہوش کھو بیٹھے تھے، یہاں تک کہ خود حضرت عمرؓ کا کہنا تھا کہ اگر کسی نے یہ کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات ہوگئی ہے تو میں اس کی گردن کاٹ دوں گا، لیکن ایسے سنگین حالات کو قابو میں کرنے والا اگر کوئی شخص ہے تو وہ بھی حضرت ابو بکرؓ ہی کی شخصیت ہے کہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ تمام پیچیدہ مسائل کو بآسانی حل کر دیا۔

حال کی مماثلت

البتہ جہاں تک حال کا تعلق ہے، اس کو بھی سمجھنا مناسب ہوگا، روایت میں آتا ہے کہ جب حضور ﷺ معراج کو تشریف لے گئے تو آپ نے آسمانوں کی سیر کی، جنت و دوزخ کا مشاہدہ کیا، لہٰذا اگلے دن صبح کو جب آپ ﷺ نے اپنا یہ واقعہ لوگوں کو بتایا تو بعض نے کہا کہ دشمنان اسلام اس واقعہ پر ہمارا مذاق اڑائیں گے لہٰذا اس واقعہ کو کسی سے نہ بتانا ہی مناسب ہوگا، لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: نہیں، یہ واقعہ سچا ہے، اور میں اللہ کا رسول ہوں، تو مجھے بتانے میں کیوں تردد پیش آئے گا؟ لہٰذا جب آپ نے اس واقعہ کو بیان کیا تو کفار نے مذاق اڑایا، لیکن جب یہ واقعہ حضرت ابو بکرؓ کو سنایا گیا، تو آپ نے بغیر کسی تردد کے یہ فرمایا: اگر اللہ کے نبی یہ فرما رہے ہیں کہ مجھے آج معراج ہوئی ہے تو بلاشبہ یہ

واقعہ سچا ہی ہوگا، کیونکہ جب ہم نے مانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں، اور جبرئیل علیہ السلام ان کے پاس اوپر سے وحی لاتے ہیں، تو اگر یہ کہا جائے کہ ایک دفعہ نیچے والے اوپر ہو کر آئے ہیں تو اس کو ماننے میں کیا حرج ہے؟ اسی لیے ایسی کیفیت کا پایا جانا ہی انسان کے حال کے اچھا ہونے اور نبی کے حال سے مماثلت کی کھلی علامت ہے، کہ حضرت ابوبکر کو اتنے بڑے واقعہ پر بھی ذرا سا تردد نہ ہوا۔ خلاصہ یہ کہ حضرت ابوبکر، حال، قال، اور عمل ہر اعتبار سے صدیقیت کے مقام پر فائز تھے۔

اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر جب تمام صحابہ کرام کو آگے جانے سے روک دیا گیا تھا، حالانکہ قرآن میں یہ حکم آچکا تھا کہ ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ﴾ (الفتح:۲۷) تو تمام صحابہ کو اس بات پر اعتراض تھا کہ جب قرآن میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ "تم ضرور بالضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے" تو آخر ہم واپس کیوں جائیں؟ چنانچہ حضرت عمرؓ نے یہی اعتراض حضرت ابوبکرؓ سے ظاہر فرمایا، تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا: قرآن میں کہا گیا ہے کہ تم ضرور داخل ہو گے، لیکن یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اسی سال اور ابھی داخل ہونا ہے، لہٰذا انشاء اللہ اگلے سال ہم لوگ آئیں گے، اور پھر یہی اعتراض جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی جواب دیا، غرض کہ حضرت ابوبکرؓ کو جہاں

بھی دیکھا جائے تو ان کا کوئی ہمسر اور خلیل نظر نہیں آتا۔

حضرت عمرؓ کا مقولہ

اسی لیے حضرت عمرؓ بار بار مختلف موقعوں سے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ ابو بکر تو بہت آگے بڑھ گئے، بلکہ حضرت عمرؓ کا یہاں تک کہنا تھا کہ ابو بکرؓ اگر مجھے اپنی زندگی کی دو قیمتی چیزیں عطا کر دیں تو میں ان کو اپنی ساری زندگی کی عبادات دینے کے لیے تیار ہوں،" ایک وہ رات جو انہوں نے غار ثور میں رسول ﷺ کی نصرت میں گزاری ہے" اور دوسرے "ان کا مرتدین سے جنگ کرنا"۔

حضرت عمرؓ کی خصوصیت

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: لَقَدْ كَانَ فِيمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْأُمَمِ نَاسٌ مُحَدَّثُونَ، فَإِنْ يَكُ فِي أُمَّتِي أَحَدٌ فَإِنَّهُ عُمَرُ. (١)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے پہلے کی امتوں میں کچھ لوگ صاحب الہام ہوئے تھے، میری امت میں اگر کوئی ایسا ہے تو یقیناً وہ عمر ہیں۔

فائدہ:- صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کا مقام ہے، حضرت عمرؓ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی سمجھ، غیر معمولی محبت اور غیر معمولی فدائیت کا جذبہ عطا فرمایا تھا، اسی وجہ سے حضرت عمرؓ کا لقب ''فاروق'' تھا، یعنی حق و باطل کے درمیان تفریق

(١) صحيح البخاري، كتاب فضائل الصحابة: ٣٦٨٩

کرنے والا، اسی لیے بہت سی ایسی باتیں ہیں جن پر حضرت عمرؓ نے نکیر فرمائی اور اسی کی تائید میں وحی الٰہی کا بھی نزول ہوا، جیسے شراب کی حرمت کا مسئلہ ہے، جس کی حرمت کے نزول سے قبل حضرت عمر حضور ﷺ سے بار بار کہتے تھے کہ حضرت شراب پینے کے تعلق سے غور کرنے کی ضرورت ہے، بالآخر ایک دن شراب کی ممانعت کے تعلق سے وحی الٰہی کا نزول ہی ہوگیا ﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ﴾ (المائدۃ: ۹۰) یعنی تم پر شراب اور جوئے وغیرہ کو حرام کر دیا گیا۔

موافقت کی اعلیٰ مثال

اسی طرح روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ انسان کی تخلیق کے مراحل کے تعلق سے کچھ آیات کا نزول ہوا، جن کو سن کر حضرت عمرؓ کی زبان سے برجستہ یہ جملہ نکلا ﴿فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ (المومنون: ۱۴) اور فوراً اس کے بعد بعینہ انہی الفاظ کے ساتھ وحی کا بھی نزول ہوا۔ معلوم ہوا اس اعتبار سے حضرت عمرؓ کی شان غیر معمولی ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: تم سے پہلے جو لوگ ہوئے ہیں ان میں کچھ لوگ صاحب الہام ہوا کرتے تھے میری امت میں اگر کوئی ہے تو وہ عمر ہیں۔

حضرت عمرؓ کی دور اندیشی

اسی طرح ایک مرتبہ حضور ﷺ کسی باغ میں تشریف فرما تھے، جہاں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، اچانک آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ابوہریرہ! یہ میرے جوتے لے کر باہر جاؤ اور جو شخص ملے اس کو جنت کی خوش خبری سنادو، چنانچہ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ سے ملاقات ہوئی، حضرت ابوہریرہؓ نے ان کو فرمان نبوی سنا دیا، پھر اس کے بعد حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی، اور ان کو یہ خوش خبری سنائی، لیکن حضرت عمر بجائے اس کے کہ اس خبر پر خوشی کا اظہار فرماتے بلکہ آپ نے حضرت ابوہریرہؓ کو ایک دھکا دیا، یہاں تک کہ وہ گر پڑے، اور روتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور پورا قصہ سنایا، چنانچہ حضرت عمر بھی تشریف لائے اور فرمایا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے یہ اس لیے کیا کہ اگر یہ خوشخبری عام کردی گئی، تو لوگ اعمال میں سستی برتنا شروع کردیں گے، لہٰذا حضرت عمرؓ کی اس رائے پر حضور ﷺ مسکرائے اور کچھ بھی نہیں فرمایا۔

اسی طرح جب عبداللہ بن ابی سلول جو کہ منافقین کا سردار تھا، اس کی نماز جنازہ کے لیے جب آپ ﷺ آگے تشریف لائے تو حضرت عمرؓ نے آپ کا دامن پکڑلیا، یہاں تک کہ بعد میں خود حضرت عمرؓ کا کہنا ہے: نہ

جانے مجھ میں یہ جرات کہاں سے آگئی کہ میں سرور کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ کا دامن پکڑلوں، اور آگے جانے سے منع کروں، لیکن بعد میں حضرت عمرؓ کی اس بات کی تائید میں قرآنی آیات کا نزول ہوا ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِّنْهُم﴾ (التوبة:٨٤) کہ اے نبی ﷺ! ان میں سے کسی کی بھی آپ نماز جنازہ نہیں پڑھیں گے۔

اسی طرح ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت سلمانؓ کو ان کے یہودی مالک نے یہ شرط لگائی کہ اگر تم کھجور کے سو درخت لگادو، اور وہ جب پھل دینے لگیں تو میں تم کو آزاد کردوں گا، لہٰذا انہوں نے اپنی یہ پریشانی حضور ﷺ کے سامنے رکھی، تو حضور ﷺ نے فرمایا: اس سے یہ معلوم کرو کہ کس باغ میں لگانا ہے؟ جب اس نے بتادیا تو آپ ﷺ خود تشریف لے گئے اور اپنے دست مبارک سے شجر کاری فرمائی، لیکن اتفاق سے ایک پودا چپکے سے حضرت عمرؓ نے بھی لگادیا، چنانچہ جب درخت پھلا تو سارے درختوں پر پھل تھے لیکن وہ درخت جس کو حضرت عمرؓ نے رکھا تھا اس میں کوئی پھل نہیں آیا، جب معلوم کیا گیا کہ اس میں پھل کیوں نہیں آئے؟ تو حضرت عمرؓ نے بتایا کہ اس کو میں نے لگایا تھا، اور بقیہ سارے درخت آپ ہی کے دست مبارک سے لگے ہوئے ہیں، اس لیے جو میرے ہاتھ سے لگا ہوا تھا وہ نہیں پھل سکا، اور آپ کے دست

مبارک سے لگائے ہوئے تمام پیڑ پھل چکے ہیں، لیکن حضرت عمرؓ کے اس عمل سے مقصود یہ تھا کہ آنے والی امت کو یہ بات بتائی جاسکے کہ درختوں کا اسی سال پھل دینا کسی کا کرتب نہیں ہے، بلکہ حضور ﷺ کے دست مبارک کی برکت تھی کہ وہ درخت پھل لائے، ورنہ اگر کوئی کرتب ہی ہوتا تو وہ درخت جس کو انہوں نے لگایا تھا وہ بھی پھل لاسکتا تھا۔

فراست ایمانی

حضرت عمرؓ جب خلیفہ ثانی مقرر کیے گئے تو آپ نے ہر جگہ کے گورنران کو متعین فرمایا، لیکن ایک دن حضرت حذیفہؓ (جن کو حضور ﷺ نے تمام منافقین کے ناموں کو بتایا تھا) سے معلوم کیا کہ میرے گورنران میں سے کوئی منافق تو نہیں ہے، تو حضرت حذیفہ نے فرمایا: ایک منافق ہے، لیکن میں نام نہیں بتا سکتا، کیونکہ یہ حضور ﷺ کا بتایا ہوا راز ہے، جس کو افشاء کرنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ لیکن چونکہ حضرت عمرؓ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی فراست سے نوازا تھا، آپ نے اسی رات تمام گورنران کا جائزہ لیا، اور ایک کو گرفت میں لے لیا، پھر جب صبح کو حضرت حذیفہ سے معلوم کیا کہ کیا یہی وہ منافق ہے؟ تو حضرت حذیفہ نے بھی اس کی تائید فرمائی، اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ غیر معمولی ذہانت وفراست کے حامل تھے۔

محتاط بیانی

ایک مرتبہ حضرت ابوموسی اشعریؓ حضرت عمرؓ کے گھر تشریف لائے اور تین مرتبہ اجازت چاہی، لیکن اندر سے جب کوئی آواز نہیں آئی تو آپ واپس جانے لگے، لیکن اتنے میں حضرت عمرؓ نے بلایا: کہ آیئے واپس کیوں جاتے ہیں؟ تو حضرت ابوموسی اشعریؓ نے فرمایا: اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے اگر کوئی تین مرتبہ تک اجازت نہ دے تو واپس ہو جانا چاہیے، چنانچہ اسی بات پر حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا: اگر اس حدیث کا تمہارے پاس کوئی گواہ ہو تو بتاؤ، ورنہ میں اس کے جرم میں کوڑے لگاؤں گا، چنانچہ حضرت ابوموسی اشعریؓ اس بات پر بہت پریشان ہوئے، الغرض وہ صحابہ کرام کے پاس گئے اور سب کے سامنے صورت مسئلہ کو بیان فرمایا، اور کہا اگر کوئی اس حدیث کا جاننے والا ہو تو بتائے، چنانچہ ایک صحابی ایسے تھے جنہوں نے یہ حدیث اللہ کے رسول ﷺ سے سنی تھی، انہوں نے کہا: میں اس کا گواہ ہوں، لہٰذا حضرت ابوموسی اشعریؓ جب ان صحابی کو لے کر حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے تو حضرت عمرؓ نے ان کی بات کو مان لیا، لیکن حضرت عمرؓ کا اس عمل سے صرف یہی مقصود تھا کہ احادیث رسول ﷺ کو بیان کرنے میں لوگ محتاط بیانی سے کام لیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہر خاص و عام جو چاہے کہے۔

حضرت احنف بن قیس کا واقعہ

ایک مرتبہ ایک بڑے مقرر حضرت احنف بن قیس حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں مدینہ منورہ تشریف لائے، اور بہت عمدہ تقریر فرمائی، جس سے پورے مدینہ میں ان کے گن گائے جانے لگے، چنانچہ جب وہ اپنے وطن کو واپس جانے کے لیے حضرت عمرؓ سے اجازت طلب کرنے کے لیے تشریف لائے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: ابھی آپ کو یہیں رکنا ہوگا، جب ہماری اجازت ہوگی تب آپ یہاں سے تشریف لے جائیں گے، الغرض حضرت احنف بن قیس تقریباً مکمل ایک سال تک مدینہ منورہ میں تشریف فرما رہے، اور ایک سال کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا: اب تم جاسکتے ہو، لیکن اس واقعہ پر حضرت احنف بن قیس نے دریافت فرمایا: کہ اتنے دن آپ کے یہاں روکے رکھنے کا راز کیا تھا؟ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: جب آپ نے اچھی تقریر فرمائی تو مجھے یہ خدشہ ہوا کہ کہیں آپ منافق نہ ہوں، اس لیے یہ جاننے کے لیے کہ کہیں آپ منافق تو نہیں ہیں میں نے آپ کو اتنے دن روکے رکھا تھا، لیکن الحمدللہ آپ کے اندر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

اصل معیار

معلوم یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص صرف کسی کی ظاہری زبان اور قلم کو

دیکھ کر مرعوب ہوتا ہے تو یہ چیز درست نہیں ہے، بلکہ اصل یہ ہے کہ انسان پہلے یہ غور کرے کہ وہ شخص صحیح معنی متبع سنت ہے یا نہیں ہے؟ کیونکہ اصل معیار اچھی تقریر وتحریر کا ہونا نہیں ہے، بلکہ اصل معیار سنت کی اتباع ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص سنت کا صحیح معنی میں پابند ہے تو وہ قابل تقلید ہے ورنہ نہیں، اور صحابہ کرام کے نزدیک اصل یہی معیار تھا کہ جو شخص سنت کے موافق ہے وہ صحیح ہے اور اگر سنت کا پابند نہیں ہے تو وہ کتنی ہی صلاحیات کا مالک ہو، ہرگز صحیح نہیں ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا واقعات سے بھی واضح ہوتا ہے۔

حضرت عثمانؓ کی حیاء

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ عُثْمَانَ: أَلَا أَسْتَحِي مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحِي مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ. (۱)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان کے متعلق ارشاد فرمایا کہ میں اس شخص سے کیوں نہ حیاء کروں جس سے فرشتے حیا (شرم) کرتے ہیں۔

فائدہ:- حضرت عثمانؓ کا مقام بھی تمام صحابہ میں نمایاں ہے، کیونکہ آپ ہی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ یکے بعد دیگرے حضور ﷺ کی دو صاحبزادیاں کے آپ کے عقد میں آئیں، اسی لیے آپ کو ذی النورین بھی کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان کو غیر معمولی

(۱) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة: ۲٤۰۱

حیا، عفت و پاکدامنی سے بھی نوازا تھا، اسی لیے روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے جہاں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی تشریف فرما تھے اور آپ کی پنڈلی کا کچھ حصہ کھلا ہوا تھا، لیکن جب حضرت عثمانؓ تشریف لائے تو آپ نے اس کو ڈھک لیا، چنانچہ حضرت عائشہ نے دریافت کیا اے اللہ کے رسول! آپ نے ان کے آنے پر ہی پنڈلی کو کیوں ڈھکا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں اس سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیاء کرتے ہیں، لیکن واضح رہے کہ اس میں کوئی شخص نعوذ باللہ یہ نہ سمجھے کہ نبی اتنے شرم والے نہ تھے، بلکہ آپ کے بارے میں روایت میں آتا ہے کہ آپ کنواری لڑکی سے زیادہ شرم کرنے والے تھے، کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ہر اعتبار سے کامل و مکمل بنایا تھا۔

حیاء کا مطلب

حیاء یا شرم کا مطلب یہ ہے کہ انسان بری باتوں سے اجتناب کرے اور ان کے کرنے میں شرم محسوس کرے، لیکن یہ اجتناب تین اعتبار سے ہوتا ہے: (۱) شریعت کے اعتبار سے بری چیز سے بچنا (۲) عقلی اعتبار سے بری چیز سے بچنا (۳) عرفی اعتبار سے بری چیز سے بچنا، یعنی ان تین طرح کے بچنے کو حیاء کہا جاتا ہے، لیکن یاد رہے کہ اگر کوئی چیز شریعت میں ممنوع ہے تو وہ عقلی اعتبار سے بھی بری ہی ہوگی، البتہ یہ الگ

بات ہے کہ انسان اس کو نہ سمجھ سکے کہ یہ بری ہے یا نہیں، کیونکہ یہ نہ سمجھنا اس کی کوتاہ نظری ہوگی نہ کہ شریعت کا نقص، اسی طرح سے جہاں تک عرف کا تعلق ہے تو اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ زمانہ میں کیا رائج ہے، مثلاً: احادیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے ساتھ دوڑ لگائی ،لیکن اب اگر کوئی انسان اس زمانہ میں یہ چاہے کہ وہ ایسا کرے تو لوگ وہ چیز بری محسوس کریں گے، کیونکہ یہ اس زمانہ کا رواج نہیں ہے، لیکن زمانہ کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ انسان اس پر عمل نہ کر سکے البتہ یہ ضروری ہوگا کہ اس کو دل سے برا نہ جانے کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو کیا ہے، معلوم یہ ہوا کہ جو چیز شریعت اور عقل اور عرف میں بری سمجھی جاتی ہو اس سے اجتناب کرنا ہی شرم وحیاء ہے، لہٰذا جو شخص جس قدر چھوڑنے والا ہوگا وہ اتنا ہی باحیاء ہوگا۔

حضرت عثمان کی پاکدامنی

درحقیقت حضرت عثمانؓ حیا کے اسی اعلیٰ مقام پر فائز تھے کہ کبھی انہوں نے زندگی میں کوئی غلط کام ہی نہیں کیا، اسی لیے جب بلوائیوں نے آپ پر حملہ کیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے کوئی مجھے قتل کرے، یا شریعت میں میرا قتل واجب ہوتا ہو، کیونکہ جن وجوہات کی بناء پر انسان کو جان سے مارا جا سکتا ہے ان میں

سے کوئی بھی میرے اندر موجود نہیں ہے، نہ ہی میں نے کبھی کسی کو قتل کیا ہے، نہ ہی میں نے کبھی زنا جیسا سنگین جرم کیا ہے، نہ ہی میں نے کوئی چوری کی ہے، نہ ہی میں اسلام سے مرتد ہوا ہوں، اور صرف ایسا نہیں کہ اسلام کے بعد یہ کام نہ کئے ہوں، بلکہ عہد جاہلیت میں بھی میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے، لہٰذا اس واقعہ سے بھی یہ علم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان انتہائی پاکدامن شخص تھے کہ انہوں نے جاہلیت کے دور میں بھی کوئی بے حیائی کا کام نہیں کیا۔

اعتراف جرم

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک شخص حضرت عثمانؓ کی مجلس میں آیا، تو حضرت عثمان کو اس پر کچھ شبہ محسوس ہوا، چنانچہ آپ نے فرمایا: لوگوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے وہ میری مجلس میں اس حال میں آجاتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپک رہا ہوتا ہے، تو اس شخص نے خود ہی اعتراف جرم کیا کہ ابھی راستہ میں میری کسی عورت پر نگاہ پڑ گئی تھی، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔

عبادات میں لطف کا فقدان

لیکن آج کل کا ماحول تو بالکل بدلا ہوا ہے، انہوں نے تو ایک مرتبہ کسی کو دیکھ لیا تھا تو فوراً پکڑ ہو گئی، اور یہاں نہ جانے کتنی مرتبہ ہم لوگ

دیکھتے ہوں گے اور اس کا احساس بھی نہیں ہوتا، کہ ہم نے کوئی غلط کام کیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آج عبادات میں بھی ہمارا دل نہیں لگتا، کیونکہ عبادات میں دل نہ لگنے کے دو بڑے اہم اسباب ہوا کرتے ہیں، ایک اکل حرام دوسرے بدنگاہی، اور آج یہی دونوں بیماریاں اس امت میں خاص طور پر عام ہو رہی ہیں، لیکن اگر کوئی ان دونوں چیزوں کو درست کر لے تو آج بھی اس کو عبادات میں وہی مزا حاصل ہوگا جو عبادات کا حق ہے، کیونکہ جس طرح سخت بخار میں کڑوی دوا دے کر یہ کہا جاتا ہے کہ جلدی فائدہ ہوگا اور انسان آنکھ بند کر کے پی لیتا ہے، اسی طرح بدنگاہی کا معاملہ ہے کہ اگر انسان کچھ صبر کر لے تو اس کے بدلہ میں جو اس نے کڑوا گھونٹ پیا ہے یعنی بدنگاہی نہیں کی ہے پھر اس کی روحانی صحت توانا ہوتی چلی جائے گی، اور عبادات میں مزا حاصل ہوتا جائے گا۔

حضرت علیؓ کی فضیلت

عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِیْ وَقَّاصٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِعَلِیٍّ: أَمَا تَرْضٰی أَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی؟ (۱)

ترجمہ:- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا: تم اس بات سے خوش نہیں کہ تم میری طرف سے اس مرتبہ پر ہو جس مرتبہ پر حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تھے۔

فائدہ:- مذکورہ بالا حدیث میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ جنگ پر تشریف لے جا رہے تھے اور مدینہ میں اپنے پیچھے مدینہ کی نگرانی کے لیے حضرت علیؓ کو چھوڑ کر جا رہے

(۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل الصحابۃ: ۳۷۰۶

تھے، لیکن اس بات کا حضرت علیؓ پر بہت اثر ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ مجھ کو یہاں پر چھوڑ کر جا رہے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو جو قوت و طاقت دی ہے وہ ایسے ہی مواقع کے لیے دی ہے کہ میں اس کے دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچا سکوں، چنانچہ جب آپ ﷺ کو اس بات کا علم ہوا کہ حضرت علیؓ جنگ میں جانا پسند کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا: کیا تم کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ تم میرے لیے ہارون کے قائم مقام ہو، یعنی جس طرح حضرت موسیٰ اپنے پیچھے حضرت ہارون کو مقرر کر کے گئے تھے تم کو بھی میں اسی طرح کر کے جاؤں، کیا یہ تم کو پسند نہیں ہے؟ بہر حال حضرت علی نے آپ کی اس تجویز کو پسند فرمایا، کیونکہ اصل تو نبی ﷺ کے حکم پر عمل کرنا ہے نہ کہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق چلنا۔

حضرت علیؓ کی بہادری

غزوۂ خندق کے موقع پر کفار میں ایک انتہائی درجہ کی طاقت رکھنے والا پہلوان بھی جنگ میں آیا ہوا تھا، جس کو نوے آدمیوں کے برابر سمجھا جاتا تھا، غرض کہ اچھے اچھے تلوار باز بھی اس سے گھبراتے تھے، لہٰذا جب اس نے خندق کا جائزہ لیا تو ایک جگہ کی چوڑائی کم پا کر اس نے اپنے گھوڑے کو چھلانگ لگائی اور مسلمانوں کی طرف آ گیا، چنانچہ اس کے سامنے حضرت علی نکل کر آئے، اور معلوم کیا کہ تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ لیکن اس نے کچھ

نہیں سنی، بلکہ طنزاً یہ جواب دیا کہ جاؤ کہیں چھپ جاؤ ابھی تم بچہ ہو، لہٰذا حضرت علی کو بھی غصہ آ گیا، اور بالآخر پھر دونوں کا مقابلہ ہوا، چنانچہ جب حضرت علیؓ نے تلوار چلائی تو وہ دم بخود نیچے گر پڑا، اور جہنم رسید ہو گیا، لہٰذا اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی بہادری عطا فرمائی تھی، جس کو انہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔

چند حکیمانہ اقوال

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کو بہادری کی خاص نعمت سے نوازا تھا اسی کے ساتھ ساتھ آپ کو حکمت کا بھی خاص ملکہ حاصل تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ مشکل سے مشکل سوال کو بھی بآسانی حل فرما دیتے تھے، اسی لیے آپ کے اقوال حکمت کی باتوں سے پُر ہوتے ہیں، جس کا آپ نے بعض مرتبہ اظہار بھی فرمایا کہ میرے پاس کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکمت کی صلاحیت سے نوازا ہے جس کے نتیجہ میں میں مسائل کو حل کر دیتا ہوں، ذیل میں آپ کے دو حکیمانہ اقوال نقل کئے جاتے ہیں:-

(۱) حضرت علیؓ سے کسی شخص نے ان کی خلافت کے زمانہ میں معلوم کیا کہ آپ کے زمانہ میں اس قدر جنگوں کا سلسلہ جاری ہے، لیکن حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں تو ایسا کچھ نہیں تھا آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا: اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مشیر ہم تھے، اور

آج ہمارے مشیر تم ہو، تو سکون و عافیت کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے۔

(۲) کسی شخص نے آپ سے معلوم کیا کہ انسان کے اختیار میں کیا چیزیں ہیں اور کیا نہیں ہیں؟ آپ نے جواب دیا: پہلے آپ اپنا ایک پیر اٹھایئے انہوں نے اٹھالیا، پھر فرمایا: دوسرا بھی اٹھایئے، انہوں نے جواب دیا یہ تو ناممکن ہے، فرمایا: تو آپ کو اتنا ہی اختیار ہے کہ ایک پیر خود اٹھایئے اور دوسرے کو رکھئے، یعنی آپ کوئی بھی کام کریئے تو اس میں پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف تو نہیں ہے، اگر نہیں ہے تو اگلا قدم رکھئے اور اگر مرضی کے خلاف ہے تو اگلا قدم نہ رکھئے۔

حضرت علیؓ کے مندرجہ بالا اقوال کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکمت کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اور آپ بخوبی یہ جانتے تھے کہ کس شخص کو کیا جواب دینا مناسب ہوگا، اسی لیے آپ کا قول تھا "کلموا الناس علی قدر عقولهم أتریدون أن یکذب الله ورسوله" یعنی لوگوں سے ان کی عقلی سطح کو دیکھ کر بات کرنا مناسب ہوتا ہے، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انجانے ہی میں لوگ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کر دیں۔

حضرت عباسؓ کی برکت سے بارش ہونا

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ كَانَ اِذَا قَحِطُوْا اسْتَسْقٰى بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ: اَللّٰهُمَّ! اِنَّا كُنَّا نَتَوَسَّلُ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِيْنَا، وَاِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا، فَيُسْقَوْنَ. (۱)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہوتے تو حضرت عمر بن الخطاب حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے بارش کی دعا مانگتے اور کہتے اے اللہ! ہم تیرے دربار میں اپنے نبی کا وسیلہ اختیار کیا کرتے تھے اور تو بارش برسا دیتا تھا، ہم اپنے نبی کے چچا کا وسیلہ اختیار کرتے ہیں،

(۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل الصحابة: ۳۷۱۰

توبارش نازل فرمادے، بارش ہوجاتی تھی۔

فائدہ:- مذکورہ بالا حدیث سے حضرت عباسؓ کے مقام بلند کا اندازہ ہوتا ہے، کہ حضرت عمرؓ ان کو کن مواقع پر وسیلہ بنایا کرتے تھے، حضرت عباسؓ حضور ﷺ کے رشتہ میں چچا تھے، اسی لیے حضرت عباسؓ آپ سے بہت محبت بھی فرماتے تھے، یہاں تک کہ ان کو یہ بات قطعاً قابل برداشت نہ تھی کہ ان کے بھتیجے کو کسی قسم کی بھی کوئی گزند پہنچے، اسی لیے انہوں نے شروع ہی سے حضور ﷺ کا ساتھ بھی دیا، اسی لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ اسلام تو بہت قبل ہی لے آئے تھے لیکن مصلحۃً لوگوں کے سامنے اس کا اظہار تاخیر سے فرمایا تھا۔

حضرت زبیر بن العوامؓ کا امتیاز

عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: انَّ لِکُلِّ نَبِیٍّ حَوَارِیًّا، وَانَّ حَوَارِیَّ الزُّبَیْرُ. (۱)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی کے مددگار ہوتے ہیں میرے مددگار زبیر ہیں۔

فائدہ:- مذکورہ بالا حدیث میں حضرت زبیر کے لیے حواری کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنیٰ مددگار کے کئے جاتے ہیں، اور یہی وہ لفظ ہے جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے ﴿قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ (آل عمران: ۵۲) کیونکہ جو حضرات ان کے ساتھ رہتے تھے ان کو حواری کہا

(۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل أصحاب النبی ﷺ: ۳۷۱۹

جاتا تھا، جن کی وجہ تسمیہ پر بعض حضرات نے روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا کہ یہ لوگ کپڑوں کو دھلتے تھے اور صاف کرتے تھے اس لیے ان کو حواری کہا جاتا تھا پھر یہ قلوب کی صفائی کرنے والے بھی بن گئے تو حواری ان کا لقب ہی پڑ گیا، اسی طرح سے حضرت زبیر کے بھی خاص تعلق کی بنیاد پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حواری یعنی مددگار کے نام سے یاد فرمایا۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ کی قربانی

عَنْ قَيْسِ بْنِ أَبِي حَازِمٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ يَدَ طَلْحَةَ شَلَّاءَ وَقَىٰ بِهَا النَّبِيَّ ﷺ يَوْمَ أُحُدٍ. (۱)

ترجمہ:- حضرت قیس بن حازمؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ احد کے دن میں نے حضرت طلحہ کا ہاتھ شل دیکھا، اس ہاتھ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ کی حفاظت کا فرض انجام دیا تھا۔

فائدہ:- حضرت طلحہؓ نے جنگ احد کے دن اپنے ہاتھ کو حضور ﷺ کی حفاظت کی خاطر ڈھال بنالیا تھا، اور تمام تیروں کو اپنے ہاتھ پر روکتے جارہے تھے یہاں تک کہ ان کا ہاتھ پوری طرح شل ہوگیا تھا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت طلحہ کو بہت اونچا مقام عطا فرمایا، اور دنیا ہی میں جنت کی بشارت عطا فرمائی، اسی لیے آپ کا شمار عشرۂ مبشرہ میں بھی کیا جاتا ہے۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب المغازي: ٤٠٦٣

حضرت سعد بن ابی وقاص کی فضیلت

عَنْ عَلِیِّ بْنِ أَبِیْ طَالِبٍ رضی الله عنه قَالَ: مَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم جَمَعَ أَبَوَیْهِ لِأَحَدٍ إِلَّا لِسَعْدِ بْنِ مَالِكٍ (یَعْنِیْ سَعْدَ بْنَ أَبِیْ وَقَّاصٍ رضی الله عنه) قَالَ: سَمِعْتُهُ یَقُوْلُ یَوْمَ أُحُدٍ: یَا سَعْدُ! ارْمِ فِدَاكَ أَبِیْ وَأُمِّیْ. (۱)

ترجمہ:- حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نہیں سنا کہ آپ ﷺ نے جمع کیے ہوں کسی کے لیے اپنے ماں باپ سوائے سعد بن ابی وقاص کے، غزوۂ احد کے دن میں نے سنا آپ ﷺ فرمارہے تھے، سعد تیر چلاؤ، میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں۔

فائدہ:- حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جب اسلام قبول

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی: ٤٠٥٩

کیا تو آپ کی عمر ۱۷ سال کی تھی، حضور ﷺ سے ان کا نانیہالی رشتہ کا بھی تعلق تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ کو حضرت سعدؓ سے خاص تعلق بھی تھا، آپ کے تعلق سے روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک خواب دیکھا تھا کہ میں تاریکیوں کے سمندر میں ڈبکیاں مار رہا ہوں، اچانک وہاں ایک چاند نظر آتا ہے، جس کے پیچھے مجھ سے پہلے تین آدمی بڑھ گئے، اور چوتھے نمبر پر میں پہنچا، چنانچہ اس خواب کو جب صبح ہوئی تو رسول ﷺ سے بیان فرمایا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے جن تین کو دیکھا تھا وہ ابوبکر، علی، زینب ہیں، اور چوتھے تم ہو، غرض کہ اس کے بعد حضرت علیؓ چوتھے نمبر پر ایمان لے آئے۔

ایمان پر ثابت قدمی

حضرت سعدؓ اپنے والدین کے بہت فرمانبردار تھے، لیکن جب اسلام قبول کیا تو آپ کی والدہ کو اس پر کچھ ناراضگی ہوئی لہٰذا انہوں نے یہ قسم کھالی کہ اگر تو اسلام کی حالت میں رہے گا تو میں کھانا نہیں کھاؤں گی، لیکن جب یہ صورت حال حضرت سعد نے دیکھی تو پہلے بہت سمجھایا لیکن جب کوئی حاصل نہیں نکلا، تو فرمایا: آپ مجھے بے شک بے انتہاء پیاری ہیں، میری ماں ہیں، لیکن اگر آپ کا یہ کہنا ہو کہ آپ کے مقابلہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو چھوڑ دوں تو ایسا کبھی نہیں ہوسکتا، چاہے

آپ سو مرتبہ بھی مر مر کے زندہ ہوں، اور کتنے ہی دن کا فاقہ ہو جائے، چنانچہ ان کی والدہ کے بھی بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ اب دین اسلام سے باز آنے والے نہیں۔

حضرت سعد کا کارنامہ

آپ کے اندر دین اسلام کے لیے قربانی اور مر مٹنے کا یہی جذبہ تھا جس کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں ایران کی طرف ساسانی حکومت سے مقابلہ کے لیے روانہ کیا، اور فرمایا: سعد! تم اس ناز میں نہ رہنا کہ ہماری اللہ کے رسول ﷺ سے کوئی رشتہ داری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں نسب نہیں چلتا ہے، بلکہ دلوں کو دیکھا جاتا ہے، لیکن حضرت سعد تو پہلے ہی سے اللہ کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر چکے تھے تو رشتہ داری پر ناز کیا کرتے، چنانچہ آپ جب وہاں تشریف لے گئے تو پورے علاقہ پر محنت کی، یہاں تک کہ سارے لوگوں کو صحیح راہ دکھائی، اور یہی وجہ ہے کہ علماء وفضلاء کا ہر میدان میں مہارت رکھنے والا ایک خاصہ طبقہ وہاں سے فارغ ہوا، جس کی حقیقت اگر دیکھا جائے تو یہ سب کچھ حضرت سعدؓ کے اخلاص کا نتیجہ تھا۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کا رتبہ

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: لِكُلِّ أُمَّةٍ أَمِينٌ، وَأَمِينُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَبُوعُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ. (۱)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے، اس امت کے امین ابوعبیدہ ہیں۔

فائدہ:- مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ میں امانت داری کی غیر معمولی صلاحیت موجود تھی، اور امانت ادا کرنا بھی دو قسم کا ہوتا ہے، ایک قسم تو یہ ہے کہ کسی نے کچھ رقم بطور امانت کسی کے پاس رکھی اور جب لی تو اس نے اتنی ہی جتنی اس شخص کی تھی بغیر کسی خیانت کے ادا کردی، لیکن امانت کی دوسری قسم یہ ہے کہ جب کوئی

(۱) صحيح البخاری، کتاب المغازی: ۴۳۸۲

امانت رکھے اور اس کی اس امانت کو واپس کرے تو وہی نوٹ واپس کردے جو اس نے امانت کے بطور رکھے تھے، اور یہ بہت اعلیٰ درجہ کی امانت ہوتی ہے، ایسے ہی حضرت ابوعبیدہؓ کا معاملہ تھا کہ یہ امانت داری کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، اسی لیے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ یہ اس امت کے امین ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: ضَمَّنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى صَدْرِهٖ وَقَالَ: اَللّٰهُمَّ! عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ. (۱)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینہ سے لگایا اور دعا دی اے اللہ! اس کو حکمت سکھادے۔

فائدہ:- حضرت عبداللہ بن عباس کا مقام اپنے تمام ہم عمروں میں سب سے نرالا ہے، آپ بچپن ہی سے علم وادب کے حصول کے متمنی رہتے تھے، آپ کی خالہ حضرت میمونہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہونے کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عباس ان کے پاس کبھی کبھی رات کو ٹھہر جاتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں رات کو اٹھ کر عبادت کے لیے کھڑے ہوتے

(۱) صحيح البخاری، کتاب فضائل أصحاب النبی ﷺ: ۳۷۵۶

تھے، تو اگر اس سے قبل حضور ﷺ کو استنجاء کی حاجت ہوتی تو آپ کے لیے پانی تیار فرمادیتے تھے، چنانچہ آپ کے اس عمل پر حضور ﷺ نے معلوم کیا کہ یہ کون کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ کرتے ہیں، لہٰذا ان کے اس حسن عمل پر آپ ﷺ نے ان کو سینہ سے لگایا اور یہ دعا دی کہ اے اللہ! ان کو علم وحکمت عطا فرما، اور یہی وہ دعا ہے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اکابر صحابہ میں کوئی ان کو ترجمان القرآن کہتا تھا، کوئی حبر هذه الأمة کے نام سے یاد کرتا تھا، کوئی عالم کبیر کہتا تھا، کیونکہ نبی نے ان کو اپنے سینے سے لگا کر دعا دی تھی اور نبی کا سینہ علم وحکمت کا گویا کہ خزینہ ہوتا ہے، جس کی مثال حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جس میں انہوں نے حضور ﷺ سے اپنے بھولنے کی شکایت کی تھی تو آپ نے ان سے فرمایا تھا کہ چادر پھیلاؤ اور پھر چادر پر کچھ لعاب دہن لگا کر فرمایا: اس کو سینہ سے لگالو، چنانچہ حضرت ابوہریرہ کا کہنا ہے کہ اس کے بعد سے میں کبھی کچھ نہیں بھولا، یہاں تک کہ روایات میں سب سے زیادہ مرویات انہیں کی شمار کی جاتی ہیں، لہٰذا اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ اگر براہ راست کسی سے نبی ﷺ کا سینہ چھو جائے تو اس کے علم وفضل کا کیا عالم ہوگا؟ اور یہ شرف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بخوبی حاصل تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا صلاح وتقوی

عَنْ حَفْصَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ صلی الله علیه وسلم أَنَّهُ قَالَ لَهَا: عَبْدُ اللّٰهِ (يَعْنِي ابْنَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا) رَجُلٌ صَالِحٌ. (۱)

ترجمہ:- حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبداللہ نیک صالح (نیک بخت) ہیں۔

فائدہ:- مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صالح فرمایا، اور عربی زبان میں صالح کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جس کے اندر صلاحیت اور صلاح مکمل درجہ کی موجود ہو، معلوم ہوا حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو یہ خوبیاں حاصل تھیں، اسی لیے تمام صحابہ کرام میں آپ اتباع سنت میں سب سے اونچے مقام پر ہیں،

(۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ۳۷۴۰

یہاں تک کہ آپ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ جو عمل حضور ﷺ نے کیا ہو وہ یہ بھی کرلیں، اسی لیے روایات میں آتا ہے کہ سفر ہجرت میں اللہ کے رسول ﷺ نے کہیں رک کر پیشاب کیا تھا، اور یہ جگہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو معلوم تھی، لہٰذا جب ان کا وہاں سے گزر ہوا تو کچھ دیر اسی جگہ پر بیٹھ کر آپ ﷺ کی یاد تازہ کرلی، اور جب لوگوں نے پوچھا تو بتایا کہ یہاں پر حضور ﷺ بیٹھ کر پیشاب فرما چکے ہیں، اسی لیے میں نے بھی اقتداء اور محبۃ یہ سوچا کہ اس سنت کو تازہ کرلوں، اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر یہی وہ محبت تھی جس کی بنیاد پر آپ ﷺ نے ان کے بارے میں رجل صالح فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت

عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ: سَأَلْنَا حُذَيْفَةَ رضی الله عنه عَنْ رَجُلٍ قَرِيْبِ السَّمْتِ وَالْهَدْيِ مِنَ النَّبِيِّ صلی الله علیه وسلم حَتّٰى نَأْخُذَ عَنْهُ، قَالَ: مَا أَعْلَمُ أَحَداً أَقْرَبَ سَمْتاً وَهَدْياً وَدَلًّا بِالنَّبِيِّ صلی الله علیه وسلم مِنْ ابْنِ أُمِّ عَبْدٍ(يَعْنِيْ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ رضی الله عنه) (۱)

ترجمہ:- حضرت عبدالرحمٰن بن یزید سے روایت ہے کہ ہم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا جو چال ڈھال اور شکل و صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت قریب ہو، تاکہ اس

(۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ۳۷٦۲

سے یہ چیز حاصل کریں (اور اس کی پیروی کریں) انہوں نے فرمایا: میں ابن ام معبد (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ) سے بڑھ کر کسی کو شکل وصورت اور چال ڈھال میں رسول اللہ ﷺ سے قریب تر نہیں پاتا ہوں۔

فائدہ:- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ زمانہ جاہلیت میں بکریاں چراتے تھے، لیکن ابتداء ہی سے آپ کے اندر امانت داری اور دیانت داری کی صفت تھی، آپ ﷺ نے ایک موقع پر ان کو غلام معلم بھی کہا ہے، کیونکہ ایک مرتبہ حضور ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مکہ کی وادیوں میں جا رہے تھے اور بھوک سے برا حال تھا کہ اچانک انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو دیکھا کہ بکریوں کا ایک ریوڑ لے کر چرا رہے ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہم آپ کی بکریوں کا دودھ لے کر پینا چاہتے تھے، انہوں نے فرمایا: نہیں، کیونکہ یہ بکریاں میرے مالک کی ہیں، اور میں ان کی اجازت کے بغیر ہرگز دودھ نہیں دے سکتا، آپ ﷺ نے ان کی یہ بات پسند فرمائی اور فرمایا: وہ بکری لاؤ جو بالکل دودھ نہ دے سکتی ہو، چنانچہ انہوں نے ویسی بکری پیش کی، اور اللہ کے رسول ﷺ کی برکت سے اس میں دودھ پیدا ہوا، جس سے آپ ﷺ نے نوش فرمایا اور حضرت ابوبکرؓ نے بھی پیا، اور خود حضرت عبداللہ نے بھی پیا، اس واقعہ کو کچھ ہی دن گزرے تھے کہ عبداللہ بن مسعود کے دل میں بے چینی کی کیفیت پیدا

ہوگئی، اس لیے فوراً اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول فرمایا، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا شروع فرمادیا یہاں تک کہ آپ کی اس قدر قربت حاصل ہوئی کہ آپ نے ان کے بارے میں فرمایا: تم کو جب ضرورت ہو تم اندر آسکتے ہو، تم کو اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اسی قربت کا یہ فیض تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی چال ڈھال بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ ہوگئی تھی۔

چار ماہر قراء

اسی کے ساتھ ساتھ آپ کو قرآن کی تلاوت کا خاص ملکہ بھی حاصل تھا، اسی لیے آپ کے بارے میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو یہ پسند ہو کہ وہ تروتازہ قرآن یعنی جس طرح اترا ہے اسی طرح سنے تو وہ عبداللہ بن مسعود کی تلاوت سن لے، اور اسی لیے آپ کا شمار قرآن کے چار ماہر صحابہ میں بھی ہوتا تھا، ایک حدیث میں آپ نے فرمایا: قرآن ان چار اشخاص سے سیکھو، ۱-عبداللہ بن مسعود، ۲-سالم مولی ابی حذیفہ، ۳- ابی بن کعب، ۴-معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم۔

نوجوانوں کا اشاعت اسلام

اخیر الذکر حضرت معاذ بن جبلؓ بھی غیر معمولی مقام کے حامل ہیں، آپ بیعت عقبہ میں شریک تھے، آپ کے تعلق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تھا

کہ یہ حرام وحلال کے مسائل کو سب سے زیادہ جانتے ہیں، آپ کو اللہ نے اشاعت اسلام کا خاص جذبہ بھی دیا تھا، جس کی دلیل حضرت عمرو بن جموح کا وہ واقعہ ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام میں داخل ہوئے، واقعہ یہ ہے:

حضرت معاذ بن جبلؓ اور ان کے ساتھیوں نے یہ خیال کیا کہ اگر بنو سلمہ قبیلہ کے سردار عمرو بن جموح اسلام لے آئیں تو پورا قبیلہ اسلام میں داخل ہو سکتا ہے، چنانچہ اس کے لیے انہوں نے ایک تدبیر سوچی کہ ان کو اپنے بت سے خاص محبت ہے کیوں نہ آج ان کے اسی بت کو باہر پھینک دیا جائے، لہٰذا انہوں نے رات کو اپنے منصوبہ کے مطابق ایسا ہی کیا، چنانچہ جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ بت غائب ہے، الغرض جب باہر نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان کا بت کسی گڈھے میں گرا ہوا ہے، تو اس کو اٹھا کر لائے اور عطر وغیرہ لگا کر رکھا، پھر اس کی پوجا کی، لیکن یہ نوجوان مستقل اپنی اس حرکت کو روزانہ رات میں کیا کرتے تھے، لہٰذا ایک دن انہوں نے اپنے بت کے پاس ایک تلوار رکھ دی تا کہ اگر کوئی آئے تو وہ خود اپنی حفاظت کر سکے، لیکن جب صبح ہوئی اور دیکھا تو پھر وہی حالت بنی ہوئی تھی، چنانچہ انہوں نے سوچا کہ جو بت خود اپنی حفاظت پر قادر نہ ہو وہ میری حفاظت کیا کرے گا؟ اور اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اسلام قبول فرمالیا، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ میں کس طرح حکمت کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ تھا، یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں ان کو جنت کی بشارت سنادی۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو زندگی میں ہی جنت کی بشارت

عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِیْ وَقَّاصٍ رضی الله عنه يَقُوْلُ: مَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ النَّبِیِّ صلی الله علیه وسلم يَقُوْلُ لِأَحَدٍ يَمْشِیْ عَلَی الْأَرْضِ: انَّهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، الَّا لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ. (۱)

ترجمہ:- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کسی کے متعلق جو زمین پر چل پھر رہا ہو فرماتے نہیں سنا کہ یہ جنت والوں میں سے ہے سوائے عبداللہ بن سلامؓ کے۔

فائدہ:- حضرت عبداللہ بن سلامؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے

(۱) صحیح البخاری، کتاب مناقب الأنصار: ۳۸۱۲

بہت بڑے یہودی عالم اور شریف مزاج انسان تھے، اسی لیے روایت میں آتا ہے کہ یہودیوں میں جو شریف خاندان باقی رہ گئے تھے ان کے سر خیل یہی تھے، ان کا اصلی نام حسین بن سلام تھا لیکن اسلام لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ رکھا، ان کے بارے میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ پہلے ہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منتظر تھے، کیونکہ انہوں نے آپ کے تعلق سے تورات میں بشارتوں کو پڑھ رکھا تھا، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی، مدینہ کی فضائیں نعروں سے گونجنے لگیں، لوگوں نے بڑے زور وشور سے استقبال کیا، تو ایسے موقع پر ان کی یہودی خالہ نے طنزاً یہ کہا: لگتا ہے کہ موسیٰ نازل ہو گئے ہوں، لہٰذا اسی وقت ان کے اس طنز کا حضرت عبداللہ بن سلام نے یوں جواب دیا: موسیٰ تو نہیں، لیکن ان کے بھائی ضرور آ گئے ہیں، اس لیے کہ یہ بھی نبی ہیں، اور اس کے بعد پھر اپنی خالہ کو سمجھایا، کہ وہ اللہ کے نبی ہیں جن کی خوشخبری تورات میں بھی موجود ہے، چنانچہ ان کی خالہ بھی اس بات پر راضی برضا ہو گئیں، اور اسلام میں داخل ہونے کے لیے بخوشی تیار ہوئیں، اور دونوں نے اسلام قبول کیا۔

یہود کی عادت

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت عبداللہ

بن سلام تشریف فرماتھے، اور یہودی لوگ حاضر ہوئے، تو انہوں نے کہااے اللہ کے رسول! آپ ان لوگوں سے میرے بارے میں معلوم کیجئے، کہ ان کی کیا رائے ہے؟ حضور ﷺ نے معلوم کیا، تو سب نے بالاتفاق بتایا، کہ وہ بہت بڑے عالم اور دین دار آدمی ہیں، اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو ہم بھی کر سکتے ہیں، چنانچہ اتنے میں حضرت عبداللہ بن سلام بھی باہر نکل آئے اور کہا میں نے اسلام قبول کرلیا اب تم لوگ بھی کر سکتے ہو، لیکن وہیں پر فوراً وہ لوگ اپنی بات سے پھر گئے، اور ان پر طرح طرح کی الزام تراشیاں اور غلط بیانیاں کرنا شروع کردیں، تو حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا: مجھے یہی امید تھی، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ کیسی غدار اور دھوکہ باز قوم ہے، لیکن ایسی قوم میں سے بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن سلام کو منتخب فرمایا۔

اللہ کے محبوب رسول کے محبوب صحابیؓ

عَنْ عَائِشَةَ رضی الله عنها: أَنَّ قُرَيْشًا أَهَمَّهُمْ شَأْنُ الْمَرْأَةِ الْمَخْزُومِيَّةِ، فَقَالُوا: مَنْ يَجْتَرِئُ عَلَيْهِ الَّا أُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ حِبُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ. (۱)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت کے معاملہ نے قریش کو فکرمند کردیا، انہوں نے کہا اس معاملہ میں (سفارش کی) کون ہمت کرسکتا ہے، سوائے رسول اللہ ﷺ کے محبوب اسامہ بن زیدؓ کے (کہ یہ جرات وہ ہی کرسکتے ہیں)۔

فائدہ:- مذکورہ بالا روایت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا تھا، جس پر مدینہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل أصحاب النبی ﷺ: ۳۷۳۲

میں یہ چہ مہ گوئیاں شروع ہوئی تھیں کہ اتنی بڑی خاتون کی سزا میں کاش دربار نبوی میں کوئی تخفیف کی سفارش کر دیتا، تو لوگوں نے یہ طے کیا کہ حضرت اسامہ حضور ﷺ کے سب سے چہیتے ہیں، انہیں کو بھیجنا مناسب ہوگا، چنانچہ سب نے ان کو سمجھا کر بھیجا، لیکن حضور ﷺ نے شریعت کے معاملہ میں ان کی کوئی بات نہیں سنی، بلکہ فرمایا: اگر فاطمہ بنت محمد (ﷺ) سے بھی ایسے جرم کا ارتکاب ہوگا تو ان کو بھی سزا دی جائے گی، شریعت کے قانون میں کوئی رشتہ داری نہیں چلتی۔

البتہ حضرت اسامہ حضرت زیدؓ کے بیٹے ہیں، جن کو حضور ﷺ نے متبنیٰ بھی بنایا تھا، لیکن بعد میں یہ منع کر دیا کہ ان کو ان کا بیٹا کہا جائے، البتہ بیٹے جیسا معاملہ اخیر وقت تک جاری رہا، اسی لیے جب ان کے صاحبزادے حضرت اسامہ کی پیدائش ہوئی تو آپ ﷺ کو طبعی طور پر ان سے بھی محبت ہوئی، یہی وجہ تھی کہ کم عمری ہی میں لوگ ان کو آپ کے محبوب کے نام سے یاد فرماتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسامہ کو کم عمری ہی سے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے بیس سال کی عمر ہی میں صحابہ کی جماعت کا امیر منتخب فرمایا تھا، جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بزرگی کا تعلق عمر سے نہیں بلکہ عقل وفہم، دیانت داری سے وابستہ ہے۔

حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی منقبت

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رضی الله عنه عَنِ النَّبِیِّ صلی الله علیه وسلم قَالَ لِجَعْفَرِ بْنِ أَبِی طَالِبٍ رضی الله عنه: أَشْبَهْتَ خَلْقِی وَخُلُقِی. (۱)

ترجمہ:- حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت) جعفر سے فرمایا کہ: اخلاق وعادات اور شکل وصورت میں تم میرے مشابہ ہو۔

فائدہ:- جن لوگوں کے بارے میں بعض دفعہ کم نظر انسان کو یہ شبہ ہوتا تھا کہ یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا کوئی اور ہیں ان میں سے ایک حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بھی ہیں، جن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ یہ شکل وصورت میں میرے مشابہ ہیں، آپ ہی کے بارے

(۱) سنن الترمذی، أبواب المناقب: ۳۷۶۵

میں آتا ہے کہ موتہ کے موقع پر آپ کے دونوں بازو کٹ گئے تھے، جس کے عوض اللہ تعالیٰ نے ان کو جنت میں دو بازو عطا فرمائے تھے، اسی لیے آپ کو ذوالجناحین اور جعفر طیار کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی اور پھر کفار مکہ کے وہاں پہنچ کر ستانے پر نجاشی کے سامنے دردِ دل سے لبریز ایک پر اثر تقریر فرمائی، اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں معلوم کیا گیا تو ﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَـٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ﴾ (النساء: ۱۵۷) والی آیت کی تلاوت فرمادی، جس کا پوری مجلس پر اثر ہوا، اور بادشاہ نے ان کو وہیں رہنے کی اجازت دی، اور خود بھی حلقہ بگوش اسلام ہوا، تقریباً دس سال کے بعد حضرت جعفر اپنی جماعت کے ساتھ مدینہ منورہ تشریف لائے، اتفاق سے انہی دنوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فتح خیبر سے واپس آرہے تھے کہ اچانک حضرت جعفر کے آنے کی خبر ملی تو آپ نے فرمایا: آج یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ خیبر کی خوشی زیادہ ہے، یا حضرت جعفر کے مدینہ میں تشریف لانے کی۔

حضرت جعفر کا رشتہ

حضرت جعفر آپ کے چچا ابوطالب کے بیٹے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، حضرت جعفر کے دو اور مشہور بھائی ہیں، جن کا نام عقیل،

اور علی ہے، لیکن چونکہ ابوطالب مالی اعتبار سے کچھ کمزور تھے اس لیے اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس سے ذکر فرمایا: ابوطالب پریشان حال ہیں، کیوں نہ اپنے بھائیوں کی کفالت کی کچھ ذمہ داری ہم لوگ بھی لے لیں، لہٰذا حضرت جعفر کو حضرت عباس نے اپنی کفالت میں لے لیا، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضور ﷺ نے اپنی کفالت میں لیا۔

حضرت ابوسفیان کا ایمان

اسی طرح سے حضور ﷺ کی شکل وشباہت میں سب سے زیادہ مشابہ ان کے دوسرے چچازاد بھائی حضرت ابوسفیان بھی ہیں، جنہوں نے شروع سے اللہ کے رسول ﷺ کی مخالفت کی، لیکن جب بعد میں توفیق ہوئی تو ہوازن کے موقع پر اپنی تمام برائیوں کا بدلہ چکا دیا، وہ اس طرح کہ مشرکین کے ایک جتھہ کو دیکھ کر ان پر حملہ کر دیا، اور اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر بے تحاشہ تیروں کی بارش شروع کر دی، چنانچہ جب حضور ﷺ نے آپ کے اس اخلاص کو دیکھا تو فرمایا: اللہ آپ کو قبول کرے، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، حضرت سفیان نے جیسے ہی آپ ﷺ کو یہ فرماتے سنا تو فوراً آ کر آپ کی قدم بوسی کی، جب کہ آپ سواری پر سوار ہی تھے، اسی لیے تاریخ میں آتا ہے کہ "ثم حسن اسلامہ" یعنی پھر آپ کا اسلام بہت خوب ہوا، اور آپ کا مقام بھی بہت بلند ہوا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو جو مقام عطا فرمایا ہے وہ دنیا میں نہ کسی کو اس سے پہلے حاصل ہوا ہے اور نہ اس کے بعد کسی کو حاصل ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ودماغ کو ایسا پاک وصاف بنایا تھا کہ ان کے ذہن ودماغ میں کدورت کا شائبہ بھی موجود نہ تھا، اور اگر کوئی یہ تصور رکھتا ہے کہ ان میں بھی کدورتیں تھیں تو دراصل یہ اسی کے دل کا روگ ہے جو اس کو اس بات پر آمادہ کر رہا ہے، لہٰذا ہم سب کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہم صحابہ کرام کے سلسلہ میں بہت محتاط رویہ اختیار کریں، کیونکہ صحابہ کرام وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے منتخب فرمایا تھا اور ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر شمع ہدایت ہے اس لیے جو اس شمع سے روشنی حاصل کرنا چاہے وہ کرسکتا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام صحابہ کرام کے متعلق ارشاد ہے "أصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم" یعنی میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے آپ جس کو بھی نمونہ بنائیں گے وہ راہ یاب ہوجائیں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحابہ والی زندگی اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.